جلد ۱۱۲ اکتوبر ۱۹۸۹ء عدد ۲

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مؤسس

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ تعالیٰ

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

سیرتِ سرورِ عالم ﷺ

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

طویل انتظار کے بعد چھپ کر آگئی ہے۔

جلد اوّل ــــــــ بنیادی مباحث
جلد دوم ــــــــ حضور کی ولادت سے ہجرت تک

- ضخامت جلد اوّل ــــ ۷۶۴ صفحات
- ضخامت جلد دوم ــــ ۷۶۴ صفحات

دونوں جلدیں نقشے اور تصاویر سے مزین

قیمت فی سیٹ : -/۲۰۰ روپے

اِدارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ

اُردو بازار ○ لاہور

فہرست مضامین

جلد ۱۱۲ | اکتوبر ۱۹۸۹ء مطابق ربیع الاوّل ۱۴۱۰ھ | عدد ۲

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

رابطہ کے لیے: ادارہ ترجمان القرآن، رحمٰن مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور

فون نمبر ــــــــ ۶۸۔۳۲۴۴۲

زرِ سالانہ تیس روپیے - فی پرچہ ۳/- روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

(نہ رسمیّت ، نہ شخصیّت پرستی)

ع "جن کے ہنگاموں سے تھے آباد ویرانے کبھی" (اقبالؒ)

جسمانی دُوری اور مکانی بُعد کے باوجود میں نے کبھی مولانا مودودیؒ سے اپنے آپ کو دُور نہیں پایا۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے وہ بغیر کسی بدنی غول کے میرے سامنے ہیں اور ان کے اِردگرد ان کے سارے مراحل و اشارات اور فرمودات و ہدایات بھی حلقہ زن ہیں، اور جیسے وہ اپنے فکر کی نمائندہ تحریروں کو کسی مجمع کے سامنے دُہرا رہے ہیں، اور جیسے میں کسی حکم کا منتظر بیٹھا ہوں مگر وہ کوئی حکم دیتے ہی نہیں۔ بس پان کھاتے جاتے ہیں۔ کچھ خاص فقرے بولتے ہیں اور ہنستے ہیں۔ پھر یکایک وہ چشمِ تصور سے غائب ہو کر قصرِ دل میں اُترتے ہیں اور ایک شہ نشین پر بچھی ہوئی قالینی جائے نماز پر بیٹھ جاتے ہیں۔ تب میرا وہ نفسیاتی رابطہ ٹوٹ جاتا ہے جس کی وجہ سے مَیں ایک فلم دیکھ رہا تھا۔

عقابِ تصور کس بلا کی قوت رکھتا ہے، اس کی پرواز تو بلاتشبیہ کچھ براق اور رفرف جیسی ہے۔ کبھی حدود مکاں میں، کبھی فضائے لامکاں میں۔

کئی لوگ مولانا کے یوم وفات پر خاص مجالس منعقد کریں گے، مقالات لکھے جا رہے ہیں، مگر مَیں اُس "سمندر" کو اُس کے طوفانوں اور موتیوں سمیت، چند سطری تحریر کے سفالچۂ حقیر میں کس طرح اُنڈیل سکتا ہوں۔ اتنی سمائی تو میری پوری شخصیت پُر معصیت کے رطلِ گراں میں بھی نہیں، بلکہ سارے زمانے کا ظرف بھی نہ اُسے زندگی میں اپنے اندر سمو سکا اور نہ آج اس کا کوئی امکان نظر آ رہا ہے۔

پورے دَورِ مودودیؒ پر نظر ڈال کر بس ایک ہی نکتہ کو بیان کرنا چاہتا ہوں۔ مولانا نے جو نصب العین دو سرے ۲م، موسسینِ جماعت کے تعاون اور مشورے سے قرار دیا، جس فکرِ شگرف کا عَلَم بلند کیا، مردانِ کار کے لیے جو معیارِ اخلاق و کردار کا لازم قرار دیا، جماعتِ اسلامی کا جو "مستقل طریقِ کار" (جس کا اساسی تقاضا شخص بہ شخص دعوتِ حق کا پہنچانا ہے) طے کیا، جماعت کے عہدوں اور ملازمتوں کے لیے علمِ دین، خدمتِ دین اور خدمتِ تحریک کے لحاظ سے خاص معیار شرائط و حدود کے ساتھ متعین کیا، بیت المال (ذمہ داری کے لحاظ سے مالِ یتیم جیسی امانت)

کے تصرف کے بارے میں جو محتاط اور متقیانہ رویّہ تجویز فرمایا، جماعت کے نظامِ مشاورت کے لیے جو محبت بھری کشادہ فضا ہر قسم کے جوڑ توڑ اور جتھا بندیوں سے پاک مہیا کی، بلکہ اپنی غیر جانبدار اور غیر تحکم دارانہ امارت و صدارت کی وجہ سے اُسے مقدس و محبوب بنا دیا ــــ تحریک کے ان سارے خطوطِ راست میں ذرا سا بھی ٹیڑھ اور تضاد پیدا کئے بغیر جس شان سے وہ اسلامی انقلاب کے قافلے کو لے کر ۳۸ سال چلے، اس کی وجہ سے میں نے ہی نہیں، بیشتر ساتھیوں نے قلتِ وسائل اور شدتِ مزاحمت کے باوجود یہی سمجھا کہ ہم اپنی انقلابی تحریک کا جھنڈا ایسے وقت کے راہوار پہ سوار ہیں [1]۔ اور چاہے کتنا ہی وقت لگے، کسی شک و شبہ کے بغیر، ہم ساری فضا پہ چھا جائیں گے۔ نہ کوئی تذبذب، نہ اُلجھن، نہ مایوسی، نہ بچتا پچتی، نہ گھٹن، اور سخت مصیبت میں بھی کبھی ہمارے سر لٹکے ہوئے اور دل بھینچے ہوئے نہ ہوتے۔

بس یہی ایک نکتہ عرض کرنا چاہتا تھا!

خدا مولانا مودودیؒ کی رُوح پر مسلسل انوارِ رحمت نازل فرمائے اور ہمیں توفیق دے کہ انقلابی تحریکی شعور کے ساتھ ہم اسی نہج پر سارے کاموں کو راست کریں اور جو امانتِ تحریک مولانا مودودیؒ اور دیگر موسسینِ جماعت اور ہزارہا سابق کارکنانِ جماعت کی طرف سے ہم تک پہنچی ہے اس کا ایک ذرہ بھی ضائع اور اس کا ایک لفظ بھی مسخ کیے بغیر ہم اُسے روز بروز زوردار تر بنا دیں۔

ع "پھر ساری یہ دُنیا تیری ہے!"

(مولانا ظفر علی خان)

---

[1] یہ تو میری اپنی کوئی کمزوریٔ ایمان یا کوتاہیٔ علم ہے کہ مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ جس راہوار پہ ہم سوار تھے، اُس نے ہمیں ایک سنگلاخ وادیٔ احوال میں پٹخ دیا ہے، میں عالمِ تصور میں اس راہوار کے پیچھے دوڑ رہا ہوں اور مجھے لازماً اس پہ پھر سوار ہونا ہے۔ ورنہ میرا کوئی مستقبل نہیں ــ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ربیع الاول بڑی سعادتوں اور برکتوں کا مہینہ نگاہوں کے سامنے جلوہ فگن ہے۔ ہمارے سامنے ہر لمحہ نورِ ہدایت کا بہتا ہوا دریا قانونِ قرآن اور اسوۂ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں موجود ہے۔ میلادِ حضورؐ اور اس کے ساتھ دعوتِ حضورؐ، سیرتِ حضورؐ، نقشۂ تنظیم و تزکیۂ حضورؐ، ہجرتِ حضورؐ، جہادِ حضورؐ، سیاسی و معاشی لحاظ سے نظامِ حضورؐ، مشاورتِ حضورؐ، عدالتِ حضورؐ اور عبادت و خلقِ حضورؐ کی ساری تجلیات سامنے آتی ہیں، تو نورِ ہدایت کا دریا ٹھاٹھیں مارنے لگتا ہے۔

اگر یادِ حضورؐ اور ذکر و بیانِ حضورؐ کے نتیجے میں دلوں کو کچھ بھی روحانی قربِ اللہ تعالیٰ سے محبت و طاعت کا والہانہ تعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اور اخلاقی معیارات اور معاشرے کی تھوڑی بہت بلندی حاصل ہو جائے تو گویا مراد مل گئی، ورنہ ؎

خرِ عیسیٰؑ اگر بہ مکّہ رَوَد   باز آید، ہنوز خر باشد

ایمان و عمل اور فلاح و سعادت میں رتّی بھر بھی اضافہ نہ ہو تو پھر وہی مثال ہونی چاہیے، گدھا حضرت عیسیٰؑ جیسی مقدس ہستی کا ہو اور جائے بھی مکّہ شریف جیسے مقدس مقام تک، لیکن واپس لوٹے گا تو گدھے کا گدھا ہی ہوگا۔ وہ گدھے کے بجائے انسان تو کجا، گھوڑا بھی نہیں بن سکتا۔

ہر سال ربیع الاوّل آتا ہے اور ذکرِ حضورؐ سے فضائیں بھر جاتی ہیں، مگر دوسری طرف ہمارے ایمان پہلے سے کمزور ہو جاتے ہیں، دولت ہمارے اوپر سواری کرتی ہے۔ مفاد کے بتوں اور عہدوں کے دیوتاؤں کے صنم خانے اور زیادہ آباد ہو جاتے ہیں، اخلاقی

پستی کے نتیجے میں جرائم اور بڑھ جاتے ہیں، تشدد کا زور ہے، انتقام کے چکر چل رہے ہیں، اُمتِ محمدیہؐ کی خواتین کی عصمتیں دن دیہاڑے خود قومی رکھوالوں کے ہاتھوں لُٹ رہی ہیں۔ تخریب کا دَور دَورہ ہے، انسان ہر جگہ روندا کچلا ہوا اور کراہتا ہوا ملتا ہے جس کو مشینیں اور کمپیوٹر اور خلائی جہاز اور ایٹم بم، کمپیوٹر اور روبوٹ سب تحقیر آمیز خندہ زنی کا نشانہ بنائے ہوئے ہیں۔

اُمتِ محمدیہ اِن سارے معاملوں میں کسی کافر قوم سے پیچھے نہیں، دعویٰ عقیدۂ توحید کا اور عمل علاقہ پرستی، نسل پرستی اور طبقہ پرستی پر، درس اتحاد کا، اور کیا سیاسی اسٹیج اور کیا صحافتی ناقوس اور کیا واعظوں کے منبر سب کے ذریعے افتراقات کا زہر چاروں طرف بکھیرا جا رہا ہے ـــ اپنا نام مسلمان قوم یا اُمتِ محمدیہ اور ملتِ اسلامیہ قرار دینا اور سروں پر ہر جگہ مسلط لادینیت اور طاغوتی نظام اور مادہ پرستانہ طرزِ فکر، منصب، دنیا کو تعلیم فلاح دینا، مگر اپنا جہانِ افکار سارے کا سارا باطل فلسفوں اور نظریوں سے تعمیر شدہ، اور عملی خدمات نظامِ الحاد اور ادارہ ہائے فسق وفجور کی گاڑیوں کو کھینچنے کے لیے بے مزد قلیوں کی!

بہ حالِ زار ـــ اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جماعت بنتے ہو اور ربیع الاول کے آنے پر محبتِ رسالتؐ کے جھنڈے اُٹھا کر نعرے لگاتے ہو۔ اِس پُر تضاد صورتِ حالات پر اقبالؒ نے (حضورؐ کی خدمت میں) عرض کیا تھا۔

ع کہ ما شایانِ شانِ تُو نہ بُودیم

یعنی ہم کج فکر، پست اخلاق اور مریضانِ تضاد و نفاق آپ کے شایانِ شان (پیرو کار یا مردانِ جہاد، یا علمبردارانِ انقلاب) نہ تھے۔

میں اِس مبارک مہینے کی مقدس فضا میں اوّل تو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حدیثِ پاک "خیرالقرون قرنی ..... الخ" کی سچائی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ انسانیت اپنی

ساری حکمت و دانش، ساری سائنسی ترقیات، ساری ٹیکنالوجی کی مہارتوں، ہوش رُبا ایجادوں، عیاشی کے گوناگوں اداروں اور تفریحات و جمالیات کے سامانوں اور شاندار جمہوری ایوانوں کے باوجود پستی میں گر رہی ہے۔ میری عمر جب حالتِ شعور کو پہنچی تو اس وقت سے لے کر اب تک (تقریباً ۶۰، ۶۲ سال) ہر پہلو سے زوال اور ذلت دیکھ رہا ہوں، اور پھر یہ دردناک حقیقت بیان کرنا چاہتا ہوں کہ گراوٹ کی اس گاڑی پر ہم مسلمان بھی سوار ہیں۔ بلکہ سوار کیا ہیں، بے اختیار ہیں۔ اور اس بے اختیاری کے باوجود اس گاڑی کے انجن میں فائرمین بھی بنے ہوتے ہیں۔

ہماری مظلوم مسلمانی کا حال یہ ہے کہ ہمارے گرد الحادی نظریات اور مادی تہذیب کے عالمگیر آسیب نے اس بُری طرح محاصرہ کر لیا ہے جیسے بردہ فروش کسی کو اغوا کر کے لے جائیں اور ذی شعور جانوروں کے ہاتھ بیچ دیں۔ بلکہ یہ تو قوم کی قوم کا اغوا ہے۔ اور خود قوم کو کسی نادان بچے کی طرح معلوم ہی نہیں کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔

عالمی قوتوں کے ہاتھوں کی دولت مند اور تعلیم یافتہ کٹھ پتلیاں عوام کے گلّے کو ہانکے لیے جا رہی ہیں اور ان کے مال لوٹ کر ان پر اختیار اور قانون اور سیاسی مکاری کے کوڑے برسا رہی ہیں ـــــ اور پھر کہتے ہیں کہ اس کا نام جمہوریت ہے۔

حالانکہ جمہوریت اور سائنس اور علم و ترقی کے خداوندوں نے ہمارے گرد ایک ایسی دُنیا بنا کر اس میں ہمیں محبوس کر دیا ہے جس میں ایمانی و اخلاقی ہی نہیں، جانی و مالی تباہی کے جھکڑ اُٹھ رہے ہیں۔

انہی خداوندوں کے بنائے ہوئے معاشروں نے روزمرہ کے معمولی جرائم کو بڑھا کر ہائی جیکنگ اور تخریب کاری تک پہنچا دیا ہے۔ انہی کے افسوں سے ہیروئن خود ان کے معاشروں میں تباہی کا سامان بن گئی ہے۔ حالانکہ اور کتنے منشیات جن میں شراب شامل ہے خود نئی تہذیب کی بھٹیوں میں کشید ہوتی اور مغرب میں حلال قرار پا کر پھیلتی اور مشرق میں بھی نفوذ کرتی ہے۔ ہم لوگ اس گندی نشہ بازی سے بچنا چاہتے ہیں۔ مگر اس کو روکنا تو کجا اس کے خلاف آواز اُٹھانا بھی خلافِ تہذیب ہے۔ مگر خود اُن کو اگر ہیروئن سے تکلیف

ہے تو اس کا سدِّباب کرنے کے لیے اپنے لمبے ہاتھوں سے ہمارے ہاں کے انسانوں کو سزائے موت تک دینا لازم سمجھتے ہیں، بلکہ ہیروئن کی لپیٹ میں سیاسی حریفوں کو بھی شکار کرتے ہیں۔

انہی خداوندانِ تہذیب نے ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم جیسی بلائیں ہزار در ہزار انسانوں کی ہلاکت کے لیے ایجاد کی ہیں، اور آج کئی ملکوں میں انسانی ہلاکت کے لیے بردیو قطار در قطار کھڑے ہیں۔

اِن خداوندانِ تہذیب کے کارپردازوں اور غلاموں نے تخریبِ ماحولیات کے سلسلے میں جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کی مدد سے جو خوفناک کارکردگی دکھائی ہے اس کا ایک جامع تاثر مجھے کتابِ ہلاکت (DOOMSDY BOOK) کے مطالعہ سے ملا۔ اور درسیوں سائنسی وجوہ، حوالوں اور اعداد و شمار کے ساتھ ایسے بتائے گئے ہیں جن میں ہر ایک انسانی زندگی کی جڑ کاٹنے اور کرۂ ارضی کو زندگی کے لیے ناسازگار بنانے میں موثر عامل کا کام کر رہا ہے۔ خود ہی نئے دور نے آلودگی (POLLUTION) کے خطرناک سامان پیدا کیے اور پھر خود ہی اس صورتِ حال کا ماتم کرنا شروع کر دیا۔ میں نے ۱۹۷۱ء میں یہ کتاب پڑھی اور اس کی دو پیش گوئیاں میرے سامنے تشکل پذیر ہیں۔ ایک یہ کہ کرۂ ارضی کی بہت بعید فضاؤں میں "اوزون" گیس کی جو تہ اہلِ زمین کی حفاظت کائناتی شعاعوں کے مضر اثرات سے کرتی ہے اس کو ایٹمی قوت جدید مشینری اور نئی ایجادوں کے استعمال سے تباہی کا خطرہ ہے۔ چنانچہ اخبارات میں یہ بات آچکی ہے کہ اوزون کو نقصان پہنچ چکا ہے اور کچھ کائناتی شعاعیں زمین پر آنے لگی ہیں۔ مزید اضافہ یقینی ہے۔ اس کتاب کی سائنسی پیش گوئی کے مطابق زمین کا درجۂ حرارت بڑھ چکا ہے۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا!

سائنس اور آسائش و عشرت میں مزے ہی مزے نہیں ہیں، دوسرا تاریک پہلو بھی ہے۔

انہی خداوندانِ تہذیب کے تباہ کاروں کا ایک کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے کیمیاوی اسلحۂ ہلاکت کو ایجاد کر کے اس کے ذخیرے بنائے اور کارخانوں کی توسیع کے ساتھ ان

ہتھیاروں کی ہلاکت آفرینی میں اضافہ کیا جا رہا ہے۔

اب جب یہ زہر مسلمان اور ایشیائی اور چھوٹی اقوام تک جا پہنچا ہے تو ”صاحب بہادر“ کبھی کندھے اچکاتے ہیں اور کبھی ناک سکیڑتے ہیں، کبھی ہاتھ ہوا میں لہراتے ہیں۔ مگر بے بس ہیں۔ جیسا کنواں دوسروں کے لیے خود کھودا تھا، ویسے کنویں دوسروں نے بھی کھود لیے ہیں۔ اگرچہ تباہی دوطرفہ ہو گی۔

جنیوا پروٹوکول (۱۹۲۵ء) جو زہریلی گیس استعمال کرنے کو ممنوع قرار دیتا ہے (بلکہ کہنا چاہیے کہ سفارش کرتا ہے) مگر اس کی تیاری اور اس کی ذخیرہ داری کو نہیں روکتا۔ حسن اتفاق سے کچھ عرصہ تک سفارش کا یہ سکہ چلتا رہا۔ پھر جاپان نے چین کے خلاف ـــــ (۱۹۳۷-۴۰ء میں)، مصر نے (۱۹۶۳-۶۷ء) میں یمن کے خلاف زہریلی اور تیزابی ڈالنے والی گیسیں استعمال کیں ـــــ کیوبا نے انگولا میں، روس نے افغانستان میں کیمیکل ہتھیار استعمال کیے۔ شمالی افغانستان میں کئی گاؤں پورے کے پورے صاف ہو گئے۔ لیکن گیس بردار اور گیس کو معلوم کرنے والے آلات سے آراستہ روسی سپاہیوں کے اقرار کے باوجود کوئی یقین کرنے کو تیار نہ ہوا۔ اس تباہ کاری کے سب سے بڑے علمبردار تو روس اور امریکہ ہیں، تمام یہودی ریاستیں ہیں، اسرائیل اور بھارت ہیں۔

مگر ہم پیروانِ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور سرمستانِ ماہ ربیع الاول بھی سمجھے نہیں ہیں۔ اس وقت ایران، عراق، شام، لیبیا وغیرہ میں زہریلی گیس کے کارخانے اور ذخائر روز افزوں ہیں (پیش پیش = لیبیا)۔ ابھی ابھی مسلمانانِ عراق کی حکومت اور فوج نے کردستان کے مسلمانوں کی تباہی کے لیے حملہ کیا۔ اس حملہ میں تین ہزار سے لے کر پانچ ہزار تک (جن میں عام نہتے شہری مرد و زن اور بچے شامل ہیں) پوری طرح ہلاک ہو گئے اور بہت سی تعداد مستقلاً بدہیئت اور معذور اور دردمند ہو کر رہ گئی ہے جس میں سے آہستہ آہستہ لوگ مرتے چلے جا رہے ہیں۔

ریڈرز ڈائجسٹ کے تازہ شمارے میں ایک مضمون BY RELF KINNEY BENNET شائع ہوا ہے۔ اس میں کُرد قصبے حلب جاہ پر عراق کے کیمیکل حملے کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔ بڑی گڑگڑاہٹ کے بعد ایک کہر سا گلیوں میں پھیلنے لگا۔ جو ہوائی جہاز حملہ کر رہے تھے، ان کو جنہوں نے دیکھا اُن کی آنکھیں پتھرا گئیں، اُلٹیاں آنے لگیں، اُن کے مونہوں سے سبز رنگ کا جھاگ اور خون بہنے لگا، اُن کے چہروں کا رنگ سُرخی آمیز نیلا ہو گیا۔ لندن ڈیلی ٹیلیگراف لکھتا ہے کہ "حلب جاہ ایک کھُلی قبر بن گیا۔ مائیں بچوں کو سینے سے لگائے، نوعُمر لڑکیاں خوش رنگ لباس پہنے، چھوٹے بچے نائیلون کے لباسوں میں پل بھر میں حوالۂ مرگ ہو گئے۔ کئی ہزار افراد کی اس مظلومانہ تباہی کے خلاف اقوام متحدہ کے تحت جمع ہونے والی ۵۰ اقوام تحریک کے باوجود کوئی قرارداد پاس نہ کر سکیں — (جمہوریت زندہ باد)

مسلمان کا مسلمان کو قتل کرنا یا مسلمان قوم کا کسی دوسری مسلمان قوم کو تباہ کرنا اتنے بھاری جرائم ہیں کہ اسلام میں ان کی کوئی جگہ نہیں۔

ایسے مسلمان افراد، ایسی مسلمان جماعتوں، ایسی تحریکوں اور ایسی حکومتوں کی ضرورت ہے جو ربیع الاول کو مبارک بنانے والی ہستیٔ اطہر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کو مضبوط کر کے اور محبتِ رسول ؐ کو افکار و کردار کی رُوح بنا کر اور حضورؐ کی دعوتِ حق اور دعوتِ عدل و سلامتی کی سچی علمبرداری کے لیے نقیب بن کر اُٹھیں۔ اپنے آپ کو الحاد اور بے دینی اور بداخلاقی اور ظلم سے محفوظ کریں اور ساری دُنیا کو توحید، حُسنِ اخلاق، محبتِ انسانیت، ترکِ ظلم اور انسدادِ بہیمیت کا سبق دینے کی جدوجہد کریں۔ اور جو ظالم طاغوتی قوتیں دُنیائے انسانیت کو خوار و خستہ کر رہی ہیں، ان سے تہذیب کو نجات دلانے کے لیے قوت مہیا کریں۔ قوت برائے دفعِ منکرات اور اقامتِ معروف، نہ کہ برائے ظلم و تباہی!

ورنہ ایمان و اخلاق کو غارت کرنے والا اور جان و مال و آبرو کے سفینے ڈبونے والا جو سیلاب اُٹھ کر روز بروز بڑھ رہا ہے اُسی کے اندر غوطے کھا کر مزے لینے ہیں تو پھر

ربیع الاوّل سے کیا مطلب ؟ اور دینِ حق سے کیا رشتہ داری ، اور دربارِ نبوت میں کونسی سند؟

ایک بدیہی مثال سامنے ہے !

کونسا سرمستِ تقدسِ ربیع الاوّل اور دلدادۂ تذکارِ رسالت مآبؐ ہے جس کے نام سیور ریفل کے نام سے معروف نظامِ قمار[1] (جوا) کا ۵ لاکھ یا ایک لاکھ کا انعام نکلے اور وہ صرف اس شعور کی بنا پر کہ قرآن کو بھیجنے والے اور قرآن کو لانے والے نے قمار کی آمدنی کو حرام کر دیا ہے ، وہ دولت کے ایک ڈھیر کو ترک کر کے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے شامیانے تلے آکھڑا ہوا ؟ اگر کوئی ایسا ہوتا تو وہ ایسے سلسلے میں شریک کیوں ہوتا ؟

اسے جاری کرنے والے مسلمان ، اس کے ٹکٹ خریدنے والے مسلمان ، اس کے انعامات وصول کرنے والے مسلمان (ان کے ساتھ غیر مسلم بھی ہوں) — اور ایسے سلسلۂ قمار کو لوگوں کی آمدنیوں اور اُن کے ایمانوں پر ڈاکہ ڈالنے کی اجازت دینے اور تحفظ فراہم کرنے والے اور نظامِ جمہوری کو اپنی اکثریت کے بل پر چلانے والے بھی مسلمان ! — اور یہ سب میلاد النبیؐ کے مستانے !

بے شمار غریب لوگوں کی آمدنیاں ایک نفسیاتی مسمریزم کے زور سے سمیٹ کر چند افراد کی جھولی میں ڈال کر سرمائے کا ارتکاز پیدا کرنے کا تماشا ہو رہا ہے ۔ ۵ لاکھ افراد کی جیبیں کٹنے سے کسی ایک فرد کا دامن دولت سے بھر جاتا ہے اور چند انعام یافتہ افراد کے ساتھ اِس نظام کے کارپرداز خود بھی دولت کی اس بہتی گنگا سے خوب ہاتھ رنگتے ہیں

---

[1] بروئے حدیثِ نبویؐ اُصول یہ ہے کہ الخراج بالضمان - مدعا یہ کہ فائدہ وہ اُٹھائے جو تاوان (یا ہرجانہ) دینے کا پابند ہو — یہ صورت ناجائز ہے کہ نقصان اور لوگ اُٹھائیں اور فائدہ کسی اور کو ملے -

اب بیچ میں سے ستاون کے جاں باز سپاہیوں کی بہبود کے لیے بھی ایک رقم نکال کر سامانِ ثواب بھی کر لیا ہے۔ جیسے کہ مولانا ظفر علی خاں نے کہا تھا کہ:

۔ چندہ شاہ آباد دیتے ہیں گوہر جان بھی
خوش رہے رحمٰن بھی، راضی رہے شیطان بھی

خدا کرے کہ ہم آپ سب حقائق کو نبیؐ پاک کی تعلیم اور اُسوہ کی روشنی میں سمجھیں، اپنے فرض کو پہچانیں اور ایسی پستی میں نیچے ہی نیچے نہ گرتے چلے جائیں، جس کا مرتبۂ کمال اسفل السافلین ہے۔

قارئین متوجہ ہوں

(۱)

اجمل صاحب کے نام سے ایک مضمون بے عنوان ہمارے پاس ہے، صاحبِ مضمون کا پتہ درکار ہے۔

(۲)

ایک صاحب نے ہمیں اور مختلف حضرات کو خطوط لکھے ہیں۔ سابق خطوط میں ان کا پتہ درج تھا جو محفوظ نہیں ہیں۔ نئے خط میں صرف "ایک مسلمان" لکھا ہے۔ ہمیں پتہ درکار ہے۔

(ادارہ)

حکمتِ سیّد مودودیؒ

مسئلۂ کشمیر

ہماری نگاہ میں کشمیر کے معاملہ کی اصل اہمیت اور غیر معمولی اہمیت کس وجہ سے ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہم اپنے مُلک کے لیے ایک وسیع علاقہ حاصل کرنا چاہتے ہیں، یا اپنے مُلک کی معیشت کے لیے کشمیر کو ناگزیر پاتے ہیں۔ یہ ایک قوم پرست اور وطن پرست کا نقطۂ نظر تو ہو سکتا ہے، مگر ایک حق پرست کا نقطۂ نظر نہیں ہو سکتا۔ ہمارے لیے اس معاملہ کی ساری اہمیت صرف اس وجہ سے ہے کہ کشمیر کے ۳۰ - ۳۵ لاکھ مسلمانوں کا مستقبل ہم کو خطرے میں نظر آ رہا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ جموں کے علاقے سے بکثرت مسلمان نکالے جا چکے ہیں؟ کس کو معلوم نہیں ہے کہ پٹھان کوٹ سے دِلّی تک کا علاقہ مسلمانوں سے خالی ہو چکا ہے؟ کس سے یہ بات چھپی ہوئی ہے کہ ہندوستان نے قصداً ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت اپنے ان علاقوں کو مسلمانوں سے خالی کرایا ہے جو مغربی پاکستان کی سرحد سے متصل واقع ہیں۔ اس کو دیکھتے ہوئے کبھی یہ توقع ہی نہیں کی جا سکتی کہ اگر کشمیر کی قسمت کا آخری فیصلہ ہندوستان کے حق میں ہو گیا تو وہ زیادہ مدت تک اپنے انتہائی شمالی سرے پر ایک مُسلم اکثریت کے علاقے کو برداشت کرتا رہے گا۔ کبھی نہ کبھی وہ وقت ضرور آئے گا جب کشمیر کی ساری مسلمان آبادی، مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کی طرح گھروں سے نکالی جائے گی۔ اور مار مار کر اس کو بیک بینی و دوگوش پاکستان کی طرف دھکیل دیا جائے گا۔ آج کشمیریوں کی جو مدارات ہندوستان میں ہو رہی ہے یہ ہمیشہ رہنے والی چیز نہیں ہے۔

یہ سب کچھ تو بس اسی وقت تک ہے جب تک کشمیر کا قضیہ معلق ہے۔ اس کے یکسو

ہو جانے کے بعد یہ ہرگز اُمید نہیں کی جا سکتی کہ ہندوستان اس مُسلم اکثریت کو پاکستان کے قریب یوں اطمینان سے بیٹھا رہنے دے گا۔ اس لیے ان لاکھوں انسانوں کی خاطر جو کشمیر میں بستے ہیں، ان کی جان اور مال اور آبرو کی خاطر، اور ان کے پیدائشی انسانی حقوق کی خاطر ہم یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ انہیں ہندوستان کے چنگل سے نکالا جائے، اور ہم صاف کہتے ہیں کہ اس مقصد کے لیے ہم آخری حدود تک جانے کو تیار ہیں۔

(ماخوذ از افتتاحی تقریر مولانا مودودیؒ بہ موقع
کل پاکستان اجتماع منعقدہ کراچی ۱۹۵۱ء)

اعلان

ارکانِ جماعت اسلامی پاکستان متوجہ ہوں

کُل پاکستان اجتماعِ عام ۸ تا ۱۰ نومبر ۱۹۸۹ء لاہور میں منعقد ہو رہا ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

اس اجتماع کے پروگرام میں پہلے دن دس بجے رات اجتماعِ ارکان برائے تنقید و محاسبہ بھی شامل ہے۔ جو ارکان، امیر جماعت یا مجلسِ شوریٰ کے کسی فیصلے یا فیصلوں پر کوئی اعتراض کرنا چاہیں یا اُن کے بارے میں کوئی سوال کرنا چاہیں تو وہ ارکان کے اجتماعِ عام میں پیش کرنے کے لیے اپنا سوال یا اعتراض ۱۵ / اکتوبر ۱۹۸۹ء تک قیم جماعت کے پاس بھیج دیں۔

المعلن
محمد اسلم سلیمی قیم جماعتِ اسلامی پاکستان

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن

لالۂ صحرائی

ذیل کی تحریر، گذشتہ ماہ رمضان المبارک کی پچیسویں شب سعودی عرب کے شہر طائف میں منعقد ہونے والی ایک محفلِ شب بیداری میں پڑھی گئی۔

نحمدہٗ ونصلّی علیٰ رسولہ الکریم

حضرات گرامی!

آپ جانتے ہی ہوں گے کہ یہ کرۂ خاکی یعنی یہ زمین، جس کے ہم سب باشندے ہیں، بندوق کی گولی سے زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ، اپنے محور، سورج کے گرد، ہمہ وقت گردش کر رہی ہے لیکن اس سے بھی زیادہ عقل کو دنگ کر دینے والی بات یہ ہے کہ اپنی انتہائی تیز رفتار گردش کے باوجود، یہ زمین اپنے سینے پر بسنے والی تمام مخلوقات اور دوسری اشیا کے لیے ایک انتہائی آرام دہ پنگھوڑا بھی ہے، جس کی وجہ سے ہم سب کو ایک سیکنڈ کے کروڑویں حصے میں بھی زمین کی اس طوفانی گردش کا کوئی جھکولا یا جھٹکا محسوس نہیں ہوتا۔

زمین کی تیز رفتار گردش اور اس کی پنگھوڑے جیسی آرام دہ کیفیت سے تو ہمیں سائنس دانوں نے آگاہ کیا ہے، لیکن اس کی کچھ اور حیرت انگیز کیفیات ایسی بھی ہیں، جن کا ہم ہر روز، بلکہ دن رات کے ہر لمحے کے دوران خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ اس

کے دنوں میں اُجالا بکھیرنے اور اس کی راتوں کو منوّر کرنے والے سورج، چاند اور تارے، جو ایک نہایت ہی کڑے نظام کی پابندی کرتے ہوئے ریاضیاتی باریکیوں سے مقرر کردہ وقت کے ساتھ اُبھرتے اور ڈوبتے ہیں۔ یہ مقررہ وقتوں ہی پر موسموں کی نہایت مفید تبدیلی ــــ یہ گرمی جو ہماری فصلوں کو پکاتی ہے، اور یہ سردی، جو ہمارے دریاؤں کے لیے پانی کے محفوظ ذخیرے برف کی صورت جاتی ہے ــــ اور یہ بارش، جو دھوپ سے جلی ہوئی سطح زمین کے لیے نئی زندگی کا پیغام لاتی ہے، نیز زمین کی تہوں میں سوئے اور سہمے ہوئے گُل بوٹوں کو زمین کا سینہ شق کرکے اُبھرنے اور اپنی پھبن دکھانے کا موقعہ فراہم کرتی ہے ــــ یہ لاکھوں میل کی وسعتوں میں پھیلے ہوئے بڑے بڑے سمندر، جو گویا قانونِ قدرت کے کوزے میں بند ہیں۔ یہ کروڑوں میل کے رقبوں کو سیراب کرنے والے موّاج دریا، یہ فرشِ زمین پر میخوں کی طرح گڑے ہوئے ہیبت ناک پہاڑ ــــ یہ سب ایسے سخت گیر قانونِ فطرت کے پابند ہیں کہ اُن کے اندر کہیں صدیوں اور قرنوں میں جاکر کوئی نمایاں طبعی تبدیلی رُونما ہوتی ہے ــــ پھر یہ رات اور دن جو ایک اٹوٹ تسلسل کے ساتھ، ایک دوسرے کے پیچھے دوڑے چلے آتے ہیں ــــ دن، ہمیں زندگی کی ضروریات حاصل کرنے میں مدد دیتا ہے، اور رات ہماری دن بھر کی مشقت کا ازالہ ہمیں سکون بہم پہنچا کر کرتی ہے ــــ پھر ہمارے علاوہ اس کرۂ زمین پر بسنے والی بے شمار دوسری مخلوقات، اور ہر مخلوق کی اَن گنت قسمیں، ان میں سے بہت سی ہماری خدمت کے لیے ہر وقت مستعد، تاہم ان تمام مخلوقات کا وجود، اور ان کی زندگی ایک ایسے لگے بندھے قاعدے سے وابستہ، جس میں صدیوں کیا معنی، ماضی کے لامحدود زمانے سے نہ کبھی کوئی رخنہ ظاہر ہوا ہے، نہ جھول ــــ

حضراتِ گرامی،

یہ عظیم الشان کارخانۂ قدرت، جو اپنے حیرت انگیز، بے خلل، بے رخنہ اور بے خطا قاعدوں اور ضابطوں کے ساتھ اس کرۂ خاکی میں اَن گنت زمانوں سے مسلسل کام کر رہا ہے اور جس میں وقت کی کسی مہین ترین اکائی کے دوران بھی کوئی ٹھہراؤ پیدا نہیں ہوا۔ کیا اس بات کی گواہی نہیں دیتا کہ اس کارخانے کو چلانے والی بھی کوئی ہستی موجود ہے اور وہ ہستی ایسی

ہے، جو تمام قوتوں سے قوی ترین، تمام عظمتوں سے عظیم ترین، اور تمام ماہر صناعوں سے ماہر ترین صنّاع ہے۔ جس کی حکمت نہایت باریک، جس کی بصیرت انتہائی لطیف، جس کی تدبیریں انتہائی کامیاب، جس کے منصوبے انتہائی مکمل، اور جس کی قدرت بے پناہ اور لامحدود ہے"۔ ظاہر ہے کہ کوئی نہایت بے عقل شخص ہی کارخانۂ قدرت کو چلانے والی ایسی بالاتر ہستی کے وجود سے انکار کرے گا۔ اور سے حضرات، ہم سب، جو اس محفل میں موجود ہیں، یقیناً ایسے بے عقل نہیں ہیں۔ ہم سب اُس ہستیٔ بلند و برتر اور اُس ہستیٔ عظیم و جلیل کے وجود، اور اس کی کبریائی کا اقرار کرتے ہیں، جس کا نام اللہ ہے۔ اس کے وجود کے اقرار کے ساتھ ہم اللہ کے حضور اس کی اطاعت میں اپنی گردنیں بھی جھکاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے حضور گردنیں جھکانے والوں پر خوش ہو کر ان کا نام "مُسلم" رکھا ہے۔ الحمدللہ کہ ہم سب مُسلم ہیں۔

محترم حضرات!

میں اس سے پہلے بیان کر چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو وجود بخش کر، اس کائنات کے اندر قسم قسم کی مخلوق پیدا کر کے اور انہیں اپنے مقرر کردہ قاعدوں اور ضابطوں کا سختی سے پابند بنا کر، خود اپنی ذاتِ گرامی کی گواہی کا سامان پیدا کیا ہے۔ ادھر ہر شخص جانتا ہے کہ اس زمین پر بے رُوح، اور ذی رُوح دو طرح کی مخلوقات پائی جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہاں کی بے رُوح مخلوقات کا تو محض وجود ہی اپنے خالق کی موجودگی کی گواہی کے لیے کافی ہے، تاہم اپنی ذی رُوح مخلوقات کو اسی گواہی کی تکمیل کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایت اور رہنمائی سے نوازنا بھی ضروری سمجھا۔ مثال کے طور پر اسی خداداد ہدایت کے تحت پرندوں نے فضا میں اُڑنا، مچھلی نے پانی میں تیرنا، اور حیوانات نے مرغزاروں میں چرنا چگنا سیکھا۔ ادھر اپنی ذی رُوح مخلوقات میں حضرتِ انسان کو، اللہ تعالیٰ نے طاقتِ گویائی، قوتِ فیصلہ اور عقل و خرد کی اعلیٰ ترین صلاحیت سے نواز کر دوسری تمام مخلوقات پر اسے شاندار فضیلت کا درجہ عطا کیا۔ پھر اطاعت کے جذبے کے ساتھ نافرمانی کا اختیار بخش کر، اس دُنیا کو انسان کے لیے امتحان گاہ بنایا، تاکہ اس فانی دُنیا کے خاتمے کے بعد اپنے امتحان میں کامیابی کی صورت میں، انسان کو ہمیشہ باقی رہنے والے انعامات سے نوازے۔ ظاہر ہے کہ اس سلسلۂ عمل کے دوران حضرتِ انسان

کو بھی دوسری ذی رُوح مخلوقات کی مانند اللہ تعالیٰ کی طرف سے رہنمائی اور ہدایت درکار تھی۔ اس کی صورت اللہ تعالیٰ نے یہ تجویز فرمائی کہ اس دُنیا میں نسلِ انسانی کی ابتدا کرتے ہوئے حضرت آدمؑ کو پہلا انسان بنانے کے ساتھ ساتھ، اُسے اپنا پہلا پیغمبر بھی بنایا۔ پیغمبری کا منصب عطا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی کے ذریعے حضرت آدمؑ کو یہ بتایا کہ انہیں اپنے خالق کی پسند کے مطابق، اس دُنیا میں اپنی زندگی کس طریقے سے بسر کرنی ہوگی۔ اپنے پسندیدہ طریقِ زندگی کا نام اللہ تعالیٰ نے اِسلام رکھا اور اس طرح حضرت آدمؑ اِس دُنیا کے پہلے مُسلم بھی قرار پائے۔

حضرت آدمؑ اور اُن کی نسل کو وحی کے ذریعے صحیح طریقِ زندگی کی تعلیم و تلقین سے اللہ تعالیٰ کا ایک منشا یہ بھی تھا کہ نسلِ انسانی اپنے دُنیاوی اعمال سے اس بات کی شہادت دے کہ اللہ تعالیٰ ہی اس کائنات کا حاکم مطلق ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نازل کردہ آخری صحیفہ یعنی قرآن کریم میں میلادِ آدم سے قبل، روزِ ازل کا ذکر کرتے ہوئے سورۃ الاعراف میں ارشاد فرمایا:

ترجمہ: ”اور اے نبیؐ، لوگوں کو وہ وقت یاد دِلاؤ، جب کہ تمہارے ربّ نے بنی آدم کی پُشتوں سے اُن کو نکالا تھا، اور انہیں خود ان کے اُوپر گواہ بناتے ہوئے پوچھا کہ کیا میں تمہارا ربّ نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا، ضرور آپ ہی ہمارے ربّ ہیں۔ ہم اس پر گواہی دیتے ہیں، یہ ہم نے اس لیے کیا، کہ کہیں تم قیامت کے روز یہ نہ کہہ دو کہ ہم تو اس بات سے بے خبر تھے، یا یہ نہ کہنے لگو کہ شرک کی ابتداء تو ہمارے باپ دادا نے ہم سے پہلے کی تھی، اور ہم بعد کو ان کی نسل سے پیدا ہوئے۔ پھر کیا آپ ہمیں اس قصور میں پکڑتے ہیں جو ہمارے غلط کار لوگوں نے کیا تھا“۔

(الاعراف - ۱۷۲-۱۷۳)

گویا اللہ تعالیٰ نے نوعِ انسانی کے ہر ہر فرد کو اس دُنیا میں بھیجنے سے پہلے اس بات کا عہد لیا تھا کہ وہ اپنی دُنیاوی زندگی میں اللہ کی ربوبیت کی شہادت دے۔ اس عہد کی پاسداری کی مزید تاکید سورۃ المائدہ کی آیت ۸ میں اس طرح فرمائی گئی:

ترجمہ: ”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، خدا کی خاطر اُٹھ کھڑے ہونے والے اور

ٹھیک ٹھیک راستی کی گواہی دینے والے بنو"۔

حضرت آدمؑ کے بعد بھی تاریخ کے ہر دور اور دُنیا کے ہر خطے میں اللہ تعالیٰ بے شمار پیغمبر بھیجتا رہا تاکہ بنی نوعِ انسان برابر اس امر سے آگاہ رہے کہ اُن کے لیے دُنیا میں زندگی بسر کرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے۔ زندگی گذارنے کے صحیح طریقے کی جو گواہی اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں سے دلوائی، اُس کی وجہ قرآن مجید میں یہی بتائی گئی ہے کہ لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی رہنمائی کی حجت قائم ہوجائے، چنانچہ قرآن مجید کی سورہ النساء کی آیت ۱۶۵ میں ارشاد ہوتا ہے:

ترجمہ: "رسول خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجے گئے، تاکہ لوگوں کے پاس اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں کوئی حجت نہ رہے"۔

انسانیت اپنی پیدائش کے بعد جیسے جیسے عمر کے مراحل طے کرتی رہی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے نئے نئے پیغمبروں کے ذریعے اُسے ہر مرحلہ حیات کے مطابق ہدایت و رہنمائی ملتی رہی۔ حتیٰ کہ آج سے قریباً چودہ سو سال پہلے انسانیت اپنے بچپن اور طفولیت کے مراحل سے نکل کر بلوغت اور بھرپور شباب کے عالم میں پہنچ گئی۔ تب اللہ تعالیٰ کی حکمت کو یہ منظور ہوا کہ وہ جوان سال بنی نوعِ انسان کی دائمی ہدایت و رہنمائی کے لیے ایک مکمل اور منور آفتاب مطلعِ عالم پر ہویدا کرے، جو قیامت تک روشن رہے اور اپنی روشنی سے بنی نوعِ انسان کے سامنے زندگی کی سیدھی راہ واضح کرتا رہے۔

حضراتِ گرامی!

اللہ تعالیٰ کی رحمت کے قربان جایئے کہ ابدی نورِ ہدایت کا یہ آفتاب آج سے تقریباً چودہ سو سال پہلے آپ کے پڑوسی شہر مکہ مکرمہ کی وادیٔ حرا سے طلوع ہوا، وہاں سے ڈھلک کر چند روز کے لیے آپ کے اس شہر طائف کی فضاؤں میں چمکا، لیکن آخر کار اپنے خالق کی مرضی کے عین مطابق مکہ و طائف اور مدینہ کی محدود فضاؤں سے نکل کر، آسمانِ دُنیا کی عظیم بلندیوں پر پہنچ کر، اور جغرافیے اور وقت کی تمام حدود سے بالا تر ہو کر، وہ کل عالم کے لیے، اور ہر زمانے کے لیے خدا کی رہنمائی کا ایک منور پیغام بن گیا۔ یہ آفتابِ ہدایت اور

یہ سراجِ منیر، کہ نامِ نامی جس کا رسولِ نہامی، حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہے ___ صد شکر، کہ ہمارے خالق خداوند تعالیٰ نے ہمارے لیے مرکزِ ایمان اور تسکینِ جان بنا کر بھیجا ہے۔ وہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے گناہوں کی حدّت سے تپتی ہوئی جانوں کے لیے رحمت کی خنک پھوار بھی ہے۔ اور بروزِ قیامت ہمارے اُجڑے بکھرے اعمال ناموں کے لیے شفاعت کی بہار بھی ___ لیکن اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے اس ذاتِ گرامی کو ہمارے لیے شاہد اور گواہ بھی بنا کر بھیجا ہے، چنانچہ وہ آفتابِ ہدایت آخری صحیفۂ آسمانی کے طور، ہمیشہ تابندہ و درخشاں رہنے والی کرنوں کا جو ذخیرہ، قرآنِ کریم کے نام سے لایا، اُس کی سورۃ الاحزاب کی آیت ۱۴۳ کے آغاز میں ارشاد فرمایا گیا کہ:

ترجمہ: "اور اس طرح ہم نے تمہیں اُمتِ وسط بنایا ہے، تاکہ تم دُنیا کے لوگوں پر گواہ ہو، اور رسولؐ تم پر گواہ ہو"۔

مزید برآں سورۃ الحج کی آیت ۷۷-۷۸ میں ارشاد ہوتا ہے کہ:

ترجمہ: "اللہ نے پہلے بھی تمہارا نام مُسلم رکھا تھا، اور اس (قرآن) میں بھی تمہارا یہی نام ہے، تاکہ رسول تم پر گواہ ہو، اور تم انسانوں پر گواہ ....."

حضرات! اہلِ علم کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی ایسی آیات سے مراد یہ ہے کہ دُنیا میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے یہ زبانی شہادت اپنی ملت کے رُوبرُو دینا ہوگی کہ خدا کے احکام ہی حق ہیں اور ان کے خلاف سب کچھ باطل ہے۔ اس کے بعد اس مسلک کے جس کے وہ داعی ہیں۔ اس کا عملی مظاہرہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی پوری زندگی میں کرنا ہوگا۔ پھر بروزِ قیامت جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندوں کے احتساب کی عدالت قائم ہوگی تو اس عدالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس امر کی شہادت اور گواہی دیں گے کہ انہوں نے اپنی دُنیاوی زندگی کے دوران بندوں کو خدا کا پیغام پہنچا دیا تھا ___ اور پھر یہ جو فرمایا گیا ہے کہ اہلِ ایمان بھی لوگوں پر گواہ ہیں تو اس سے اللہ تعالیٰ کی مراد یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آنے والے[1] تمام زمانوں میں دُنیا کے ہر خطّے کے اندر اُمتِ مُسلمہ کو

[1] یہ ذمہ داری ایک حد تک صحابہ کرام پر عاید تھی کہ وہ حضورؐ کی حیات میں (باقی برصفحہ آئندہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم مقام ہونے کے طور پر عام انسانوں میں گواہ بن کر رہنا ہوگا۔ اُمتِ مُسلمہ کے افراد اپنی دُنیاوی زندگی میں اللہ تعالیٰ کے احکام برحق ہونے کی شہادت اپنی زبان سے بھی دیں گے اور اپنے اعمال سے بھی۔ نیز قیامت کے روز انہیں عام لوگوں پر اس بات کا گواہ بن کر اُٹھنا ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم تک جو کچھ پہنچایا تھا، وہ ہم نے عام لوگوں تک پہنچانے میں اپنی استطاعت کی حد تک کوئی کوتاہی نہیں کی۔

اِن آیاتِ قرآنی کی روشنی میں ہم پر اُمتِ مُسلمہ کے افراد ہونے کی حیثیت سے یہ لازم آتا ہے کہ ہم دعوت و تبلیغ کے ہر ممکن ذریعہ اور وسیلہ کو کام میں لاتے ہوئے خلقِ خدا پر اس حق کو واضح کریں جو ہمارے آقا و ہادی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اپنی پوری زندگی اور اس کے ہر پہلو میں، مثلاً رہن سہن میں، اپنے روزگار میں اور دوسروں کے ساتھ اپنے تعلقات میں ان اُصولوں کا عملاً مظاہرہ کریں اور انہیں برت کر دکھائیں جن کو ہم حق کہتے ہیں، یعنی دُنیا کے کانوں میں ہم محض اپنے شیریں وعدوں کا رس ہی نہ گھولیں، بلکہ دُنیا کی مشتاق آنکھیں ہماری عملی زندگی کے اُس حُسن کے نظارے سے بھی ٹھنڈی ہوں جو ایمان کے پرتَو سے انسان کے اخلاق و معاملات میں نمودار ہوتا ہے۔

ایک صحابی حضرت معاویہ بن حیدہ رضی اللہ عنہ اپنے اسلام لانے کا قصّہ بیان کرتے ہوئے روایت کرتے ہیں کہ مَیں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر پوچھا کہ آپؐ کو ہمارے رب نے کیا پیغام دے کر بھیجا ہے؟ آپؐ نے جواباً فرمایا کہ "خدا نے مجھے

(حاشیہ صفحہ سابقہ)

ان کے پیغام اور تعلیمات کو جن جن دوسرے لوگوں تک پہنچا سکیں، پہنچائیں اور شہادتِ حق دیں۔ جیسا کہ خطبہ حجۃ الوداع میں فرمایا کہ "فلیبلغ الشاھد الغائب" یہ فریضہ ہر مسلمان کا ہر وقت ہے کہ وہ جن رشتہ داروں، دوستوں، اجنبیوں، دوسرے علاقہ کے لوگوں تک حق کی آواز پہنچا سکے، پہنچائے۔ البتہ نبی پاک کی حیاتِ دُنیوی کے بعد اُمت پر بہ حیثیتِ مجموعی اس مشن اور مہم کی منصبی ذمہ داری عاید ہوتی ہے جس کا بیان جناب مؤلف نے کیا ہے۔ (ن ۔ ص)

دینِ اسلام دے کر بھیجا ہے"۔ جب میں نے پوچھا کہ "دینِ اسلام کیا ہے"؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اسلام یہ ہے کہ تم اپنی ذات کو اللہ کے حوالے کر دو اور دوسرے معبودوں سے دست کش ہو جاؤ، اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گویا خداوند تعالیٰ کے احکام کی عملی شہادت کی تلقین ہے ــ ایک اور صحابی حارث اشعریؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فرمایا کہ "میں تمہیں پانچ چیز دل کا حکم دیتا ہوں ــ "۱ــ جماعت کا۔ ۲ــ سُننے کا۔ ۳ــ اطاعت کا۔ ۴ــ ہجرت کا۔ ۵ــ جہاد کا ــ" یہ گویا اس بات کی تلقین ہے کہ اُمتِ مُسلمہ کے افراد پر فریضۂ شہادت ادا کرنے کی خاطر جماعت سازی اور پھر اس جماعت کے امراء کی سمع و طاعت لازم آتی ہے۔ نیز اس غرض کے لیے انہیں حسبِ ضرورت ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ سے بھی کام لینا چاہیے ــ یعنی تن، من اور دھن ہر ذریعہ سے شہادتِ حق کا فریضہ ادا کرنا ہمارا فرض ہے، بلکہ ہمارا اصل مقصدِ زندگی!

حضرات!

شہادتِ حق کا یہ فریضہ ادا کرتے وقت اپنے من اور دھن سے کام لینا بھی قابلِ تعریف ہے، تاہم اس فریضہ کی ادائیگی کی خاطر اپنا تن نثار کر دینا، شہادتِ حق کی اعلیٰ ترین صورت ہے، بلکہ مومن کی زندگی اور کردار کی معراج ہے، چنانچہ اپنے بندوں کی جانب سے اپنی ذاتِ گرامی کے حق میں اپنی جان نثارانہ گواہی کی تحسین، خود اللہ تعالیٰ نے اپنے کلامِ پاک میں فرمائی ہے۔ اس موضوع پر سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۴۲ میں ارشاد ہوتا ہے:

(ترجمہ) "اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں، انہیں مُردہ مت کہو، ایسے لوگ تو زندہ ہیں۔ مگر تمہیں ان کی زندگی کا شعور نہیں ہوتا"۔

اِس شاندار طرزِ شہادت کی اہمیت بیان کرتے ہوئے سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۴۲ میں فرمایا:

(ترجمہ) "کیا تم نے سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت میں چلے جاؤ گے، حالانکہ ابھی اللہ نے تو یہ دیکھا ہی نہیں کہ تم میں کون لوگ ہیں جو اس کی راہ میں جانیں لڑانے والے،

اور اس کی خاطر صبر کرنے والے ہیں ۔"

دراصل اللہ کی راہ میں لڑ کر جان دینے والا، اپنی جان دے کر یہ گواہی دیتا ہے کہ جس چیز پر وہ ایمان لایا تھا، وہ اُسے جان سے بھی عزیز رکھتا تھا ۔

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے، کہ حق ادا نہ ہوا

شہادتِ حق کی خاطر جان دینے والے گواہ کو "شہید" کا پیارا خطاب عطا فرما کر، اس کے رتبۂ بلند کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سورۃ النساء کی آیت ۶۹ میں ارشاد فرماتا ہے :

(ترجمہ) "جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتا ہے، وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا، جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے، یعنی انبیاء، صدیقین اور شہدا اور صالحین، کیسے اچھے ہیں یہ رفیق، جو کسی کو میسر آئیں ۔"

اسی طرح سورۂ یٰسین میں ایک مردِ حق کا ذکر کیا گیا ہے، جس کی دعوتِ حق سے تلملا کر اس کی قوم نے اسے شہید کر دیا۔ جب وہ مرتبۂ شہادت پہ فائز ہوگیا تو اللہ تعالیٰ نے اس سورہ کی آیت ۲۶ کے مطابق اسے فرمایا کہ " داخل ہوجا سیدھا جنت میں ۔" یعنی بوقت شہادت اس کا جو خون بہا، اس خون کی بوچھار نے اس کی زندگی کی لوح سے گناہوں کے تمام اندراجات دھو ڈالے۔ اور وہ بغیر کسی حساب کتاب کے جنت میں پہنچا دیا گیا۔ چنانچہ اس آیت کے بعد کی آیت ۲۷ میں ارشاد ہوتا ہے کہ جنت میں داخلے کے عظیم انعام پر۔

(ترجمہ) "اس نے کہا کہ کاش! میری قوم کو معلوم ہو جاتا کہ میرے ربّ نے کس چیز کی بدولت میری مغفرت فرما دی۔ اور مجھے باعزت لوگوں میں داخل فرمایا۔"

صاف ظاہر ہے کہ یہ شہادتِ حق کے فریضہ کی جاں نثارانہ ادائیگی ہی تھی، جو اس مردِ حق کی فوری مغفرت کا سبب بن گئی ۔

حضرات!

اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کے پسندیدہ دین اسلام کے برحق ہونے کی گواہی کے لیے

نذرانۂ جان پیش کرنے کی سعادت زمانے کے .... ہر دور میں بے شمار خوش نصیبوں کے حصے میں آتی رہی ہے۔ اِن خوش نصیبوں میں انبیائے کرام بھی شامل تھے۔ صالحین بھی اور مجاہدین بھی ـــــ پھر شہادتِ حق کی خاطر بعضوں کو اپنا نذرانۂ جان عجیب عجیب اذیتوں کے طشت میں رکھ کر پیش کرنا پڑا۔ کسی کو آرے سے چیر اگیا، کسی کو آگ کے گڑھے اور اُبلتے ہوئے تیل کے کڑاہے میں پھینکا گیا، کسی کو دار پہ کھینچا گیا، کسی کو تلوار سے ذبح کیا گیا۔ کسی کو دیوار میں زندہ چُن دیا گیا، اور کسی نے میدانِ جہاد میں لڑتے ہوئے جامِ شہادت پیا ـــــ اُمتِ مُسلمہ کی چودہ سو سالہ تاریخ ان عظیم و جلیل گواہانِ حق کے خون سے رنگین ہے، جنہوں نے خوشی خوشی خاک و خون میں رَل مِل کر رسمِ شہادت کی نئی سے نئی طرح ڈالی ـــــ خود ہمارے اس عہد میں بھی یہ رسمِ خونِش برابر جاری ہے ـــــ حق کے دشمن، اور باطل کے علمبردار، گواہانِ حق کو ماضی سے کہیں زیادہ پُراذیت طریقوں سے نشانۂ ستم بناتے، اور تڑپا تڑپا کر ان کے جسم و جان کا رشتہ ختم کرتے ہیں، لیکن یہ گواہانِ حق ہیں کہ اپنے آبا کی روایات سے دست کش ہی نہیں ہوتے، احد، احد پکارتے ہیں اور خاک و خون میں لوٹتے ہیں اور اس طرح شجاعت کی لازوال داستانوں میں ٹکڑے پر ٹکڑہ بڑھاتے ہی چلے جاتے ہیں۔ جب ایک گواہِ حق شہید ہوتا ہے تو شہید کا دوسرا دینی بھائی میدان میں اُتر جاتا ہے، یعنی بڑھتا ہے ذوقِ جرم یہاں ہر سزا کے بعد ـــــ

آج دنیا کے مختلف گوشوں میں شہادتِ حق کی انفرادی جاں نثارانہ مثالوں کے علاوہ خود ہمارے وطن کے پڑوس میں گذشتہ نو ۹ برس سے مجاہدینِ افغانستان، اللہ کے دین کی صداقت کی گواہی کا اجتماعی فریضہ جس جاں نثاری اور جاں فروشی کے ساتھ ادا کر رہے ہیں، وہ شہادتِ حق کے حسین ترین اور عظیم ترین انداز کی تازہ صورت ہے ـــــ تازہ بھی، اور قابلِ رشک بھی ـــــ شہادتِ حق کا یہ جاں نثارانہ انداز، صدیوں اور قرنوں سے ایک اٹوٹ تسلسل کے ساتھ اس دنیا میں جاری ہے اور جب تک یہ دنیا قائم ہے، اہلِ ایمان کی طرف سے اس اندازِ خاص کی بدولت اپنے سُرخ سُرخ خون کو سنہری اور فردوسی بنانے کا یہ سلسلہ انشاء اللہ ہمیشہ جاری رہے گا ـــــ

حضراتِ گرامی!

اللہ تعالیٰ آپ کے سابقہ مقامی قائد، جناب ڈاکٹر عبدالقیوم سعادت کو دین و دُنیا کی بہترین سعادتوں سے نوازے کہ جن کی یاد اب تک تحریکِ اسلامی کے حدیقہ، طائف کے ہر پھول کے دل میں خوشبو بن کر بسی ہوئی ہے۔ انہوں نے ایک مرتبہ مجھے طائف ہی سے اپنے ایک گرامی نامہ میں اقبالؒ کے دو فارسی اشعار لکھے تھے، اپنی اس ناچیز گفتگو کا اختتام میں انہی اشعار پہ کرتا ہوں، ان اشعار میں علامہ اقبال، اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہو کر یوں عرض پیرا ہیں ؎

مقامِ بندگی دیگر، مقامِ عاشقی دیگر
زِ نوری سجدہ می خواہی زِ خاکی بیش ازاں خواہی
چناں خود را نگہداری کہ بایں بے نیازی ہا
شہادت بر وجودِ خود زِ خونِ دوستاں خواہی

ان اشعار کی اُردو زبان میں ترجمانی شاید اس طرح ہو گی کہ "یاخدا تو جانتا ہی ہے کہ مقامِ بندگی کچھ اور ہے، اور مقامِ عاشقی کچھ اور — تُو نوریوں سے تو محض سجدوں ہی کا طالب ہے، لیکن خاکیوں سے تُو سجدوں سے کچھ زیادہ کا طلب گار ہے — معبود تجھے اپنے بلند و مقدس مرتبے کا کس قدر پاس ہے کہ اپنی شانِ بے نیازی کے باوجود تیرا تقاضا ہے کہ تیرے دوست اپنی رگِ جاں کا خون بہا کر تیرے وجود کی گواہی دیں۔

آیئے، دُعا کریں کہ ہم سب کو بھی ایسی گواہی کی سعادت ایک روز نصیب آجائے۔ آمین!

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

افادات حسن البناؒ شہید

ہمارے اجتماعات کی اصل غایت

ترجمہ و ترتیب: منیر احمد خلیلی

حمد و صلوٰۃ اور تحیہ و دعا کے بعد فرمایا: برادران گرامی! جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے، جب وہ سنور جاتا ہے تو سارے جسد اور انسانی شخصیت کی اصلاح ہو جاتی ہے، جب گوشت کا وہ لوتھڑا فساد زدہ ہو تو تمام جسم اس فساد و بگاڑ کی زد میں آ جاتا ہے اور یاد رکھو یہ دل ہے ..... ہم اپنے دل کا یہ حق سلب نہیں کرنا چاہتے، ہمارے دل کریمانہ اور لطیف جذبوں سے محروم نہیں رہنے چاہئیں۔ یہ کریمانہ اور لطیف جذبہ اللہ کی خاطر محبت اور اُس کی راہ میں اخوت و بھائی چارہ ہے۔ یہ جذبہ دل پر اپنا اثر دکھاتا ہے اور مختلف جہتوں سے اِس کا تزکیہ کر کے اس کا اظہار اس طرح کرتا ہے جیسے ہم اپنے حلقے اور ماحول میں دیکھ رہے ہیں۔ ہفتے میں ایک دفعہ ہمارا یہ اخلاص بھرا اجتماع اِسی جذبے کا مظہر ہے۔

میں نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ اس جذبۂ اخوت کو نظر انداز نہ ہونے دوں اور اسے کما حقہٗ پیش کروں۔ ہماری کوشش اور خواہش ہوتی ہے کہ آپ بھائیوں سے یہاں ملاقات کر کے اُس جذبے کی تسکین، تہذیب اور اظہار کا سامان کر لیں۔ ہماری ملاقات ہمارے اندر سکون و راحت اور مسرت کی کیفیات کی حامل بنے، ہماری یہاں کی گفتگو سے اُنس و محبت کے رشتے محکم ہوں۔

جیسا کہ میں ہمیشہ سے کہتا چلا آرہا ہوں اور جی چاہتا ہے کہ آپ اِسے اچھی طرح جان اور ذہن نشین کر لیں کہ علمی حقائق کے اعتبار سے، جو یہاں آ کر آپ سیکھتے ہیں، کسی بلیغ عبارت کی قدر و قیمت کے لحاظ سے جو آپ یہاں سے یاد کر کے اُٹھتے ہیں یا درس کے دوسرے رُخوں

سے جو آپ یہاں سے سمجھ کر چلتے ہیں۔ آپ کا یہاں جمع ہونا کچھ کم مفید نہیں ہے، لیکن برادرانِ محترم! یاد رکھیں، ایک چیز ان سب فوائد سے برتر اور بہتر ہے، وہ یہ کہ یہاں آکر ہماری رُوحوں کو ہمارے باہمی تعلقات کے باعث ایک تقویت اور اخوت و محبت کی ایک غذا میسر آتی ہے۔ ہمارے دل اُنس و یگانگت کی سرشاری اور سیرابی پاتے ہیں، ہم خالص اللہ کے لیے جمع ہونے اور باہم ملاقات کرنے کی حقیقی لذت اور خوشی پاتے ہیں۔

ہمارے یہاں جمع ہونے سے باہمی محبت و اخوت کی جو کیفیات اُجاگر اور پختہ ہوتی ہیں، یہی کمزوروں کی قوت و استعداد، محتاجوں کا خزانہ، ناامیدوں اور محروموں کے لیے سعادت و مسرت کی دولت ہے۔ یہ اُنہیں اُس وقت نصیب ہوتی ہے جب (معاشرے کے فاسد ماحول میں) وہ اُنس و محبت اور قلبی خوشیوں کے امکانات سے محروم ہوتے ہیں۔

آج ہماری اجتماع کی اس رات کو ہمیں چاہیے کہ جہاں ہم علمی فوائد کی تمنا لے کر آئیں وہاں رُوح کی توانائی کے اِس سامان سے غافل نہ رہیں۔ موانست و یگانگت کے رشتے روحانی اور نفسیاتی خوشی کے رُخ کو کم اہم نہ سمجھیں، اور اللہ کے لیے جمع ہونے، ملنے اور آپس میں بھائی چارے کے سچے اور مخلصانہ جذبوں سے قلبی سرور اور روحانی اطمینان حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ نیکی اور تقویٰ کے معاملے میں تعاون اور اللہ سے خالص اس کی رضا کی خاطر باہمی محبت کی دُعا کرتے رہیں، جو ہمارے لیے دُنیا و آخرت کے فیوض و فوائد کا باعث بنے۔ بلاشبہ اللہ ہی سب سے اچھا سرپرست و مددگار ہے۔

ایک انوکھی قلبی کیفیت

میرے محترم اور فاضل بھائیو! آج میرے دل میں ایک انوکھا خیال، نادر احساس اور نئی تاثیر پھوٹ رہی ہے۔ آج میں فکر و ذہن کے دوش پر پرواز کرتا ہوا، تخیل ہی تخیل میں سفر کرتا ہوا، پیچھے — بہت پیچھے — چلا گیا۔ آج شام مغرب کی نماز کے لیے کھڑا ہوا تو میرے نفس و قلب میں ایک عجیب احساس نے جنم لیا۔ میں نے نماز کی صفوں کی درستی کے اطمینان کے لیے پیچھے مُڑ کر اخوان پر نظر ڈالی۔ میرا یہ معمول ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنت پر عمل کرتا ہوں کہ آپؐ تکبیرِ اُولیٰ سے قبل ایک نظر پیچھے صفوں پر ڈال لیا کرتے تھے۔ کبھی آپؐ خود ایسا کرتے، کبھی کسی اور شخص کو حکم دیتے کہ وہ نماز کی صفوں کو سیدھا کر دے۔

آپ فرمایا کرتے تھے "صفیں درست کرلو، قدم اور کندھے ملالو اور اپنے بازو بھائیوں کے بازوؤں کے سامنے ڈھیلے چھوڑ دو"۔۔۔ تو میں نے آج پیچھے مڑ کر صف پر نگاہ ڈالی، میں تصور ہی تصور میں پوری واردات قلبی کے ساتھ، مکہ کے جوار میں، کوہِ صفا کے دامن میں پہنچ گیا۔ وہ مقام جہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعوت کے آغاز میں صحابہ کرامؓ کی جماعت کے ساتھ پوشیدہ طور پر اکٹھے ہوتے تھے۔ مختلف عمروں کے اور جدا جدا گھروں اور خاندانوں سے آئے ہوئے افراد کا گروہ، جس میں بچے بھی تھے اور ادھیڑ عمر کے افراد بھی اور جوان بھی، امیر بھی تھے، غریب بھی۔ شہرت یافتہ بھی تھے اور گم نام بھی، مہذب اور صاحبانِ علم و دانش بھی تھے اور ان پڑھ بھی، غلام بھی تھے اور آزاد بھی۔ اس مقدس گروہ کے یہ سب لوگ اتنی قلیل تعداد میں تھے کہ انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے۔ یہ سو سے کم تعداد میں تھے۔ اس گروہ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم دامنِ صفا میں جمع کرتے، انھیں روحانی فیوض سے مالا مال کرتے، کتاب اللہ کے احکام پر عمل پیرا ہونے کی تلقین فرماتے، وحی الٰہی کی آیات انھیں سناتے اور سکھاتے تھے۔ اسی مختصر سے گروہ کو لے کر آپ نئی دعوتِ حق کی روشنی میں ایک بالکل نئے عالم کی تعمیر کرنے نکلے تھے۔

میرے اخوان ساتھیو! یقین کرو، میں آج اس تصور میں اس قدر کھو گیا کہ قریب تھا کہ تکبیر اقامتِ صلوٰۃ کی بھی خبر نہ رہتی۔ میری ظاہری شخصیت میری باطنی کیفیات میں لپٹ سی گئی تھی۔ سو میں نے آج اس موقع کو غنیمت جانا کہ آپ کو واردات و کیفیاتِ قلبی میں شریک کروں ــــ ایسا کیوں نہ ہو؟ ہماری یہ قلیل التعداد جماعت بھی کوہِ صفا کے اُس مقدس گروہ کا تسلسل ہے۔ اس کے پیشِ نظر بھی ایک نئے ماحول اور نئے معاشرے کی تعمیر و تشکیل کے لیے ایک نئی دعوت ہے۔ یہ بھی عالمِ نو کی تعمیر و تزئین کا علَم لے کر اُٹھی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: "میری اُمت میں سے جب تک حق کی نمائندہ اور علَم بردار جماعت اُٹھے گی، کسی کی مخالفت اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے گی"۔ آثار میں آیا ہے: "میری اُمت میں قیامت کے روز تک خیر اور بھلائی کسی نہ کسی حد تک موجود و برقرار رہے گی"۔

حضرات! میں آپ کی شخصیات اور سینوں میں بھی اُسی گروہِ صحابہؓ کی جھلک دیکھ رہا

ہوا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں اُٹھا تھا۔ یہی نو سال سے چالیس سال کی عمر تک کے افراد کا پُرعزم گروہ، جس میں ایسے نادار بھی تھے کہ ایک روز کا پورا کھانا بھی انھیں میسر نہیں تھا، ایسے خوش حال و متمول بھی تھے جنھیں اللہ نے خاصے مال سے نواز رکھا تھا۔ یہ باہم ملاقات کے لیے جمع ہوتے تھے۔ اُنھیں جاہ و منصب، عددی برتری، سامانِ حرب و ضرب میں سے کوئی فوقیت حاصل نہ تھی۔ بس اُن کے درمیان ایک عظیم و محبوب ہستی تھی جس کا الفاظِ ربّانی میں اپنا اعلان تھا: ”اے نبیؐ، کہو کہ میں تو ایک انسان ہوں تم ہی جیسا، میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ خدا بس ایک ہی خدا ہے“۔ (کہف-۱۱۰)

اِس گروہ باصفا کے ارکان دامنِ کوہِ صفا میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد اکٹھے ہوتے تھے۔ آپ جانتے ہیں وہ کیا خواب دیکھا کرتے تھے؟ انھیں کس چیز کی فکر ہر وقت دامن گیر رہتی تھی؟ اُن کی کیا خواہشیں ہوتی تھیں؟ صفا کے دامن میں دُنیا کی نگاہوں سے چھپ کر کیسی اُمیدیں اُن کے دلوں میں انگڑائیاں لیتی تھیں؟ چپکے چپکے وہ کیا سرگوشیاں آپس میں کیا کرتے تھے؟ اُن کا نصب العین اور مطمحِ نظر کیا تھا؟

میرے بھائیو! وہ دُنیا والوں کے ذہنوں میں ایک انوکھی اور یکسر نئی عقل و دانش رکھ دینا چاہتے تھے۔ اِس سینۂ گیتی پر ایک نئی دُنیا اور نیا ماحول پیدا کرنے نکلے تھے۔ اس گوشت پوست کے انسان کو باعتبارِ مقاصدِ حیات نئے انسان کے قالب میں ڈھالنے کا عزم لے کر اُٹھے تھے۔ آسمان والے — ربّ — اور زمین والی — مخلوق — کے درمیان نئے سرے سے رشتہ قائم کرانا چاہتے تھے۔ کمزور اور ضعیف لوگوں کا یہ ننھا سا جتھا اللہ کے حکم و اذن سے عالمِ انسانیت کو ایک نئے نظام سے آشنا کر کے انسانیت کا ایک نیا نقشہ تیار کرنے اُٹھا تھا تاکہ انسان اللہ کی منشا پر اکٹھے ہو جائیں اور انسانوں کے دل ربّ العباد سے جُڑ جائیں۔ ایک نیا شعور، ایک نیا تصورِ زیست، ایک اُجلی فراست، ایک نرالی عقل جنم لے، انسانیت کے ہاتھ میں نئے اور عظیم نظام پر مشتمل نئی کتاب تھمائی جائے، بنی نوعِ انسان کے لیے نمونے کی ایک اُمت تیار ہو جو اس وصف کے واقعی موصوف ہو، جس کا ذکر اللہ تبارک و تعالیٰ نے کیا ہے: ”اب دُنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے

انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے "۔ (آل عمران ۔ ۱۱۰)

محترم و مکرم بھائیو! میں نے تصور ہی تصور میں عظیم روحانی قوتوں اور خصوصیتوں کے مالک اس گروہ میں اپنے آپ کو محسوس کیا، میں نے صفا کے دامن میں تربیت پانے والے اُس گروہ کے عدیم المثال مربی ۔ صلی اللہ علیہ وسلم ۔ کی دعوت کی بنیادوں کا جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اُس دعوت کی تین اہم اور مضبوط بنیادیں تھیں ۔ ہم اگر اپنے آپ، اپنی معاشرت و اجتماعیت کو اُنہی بنیادوں پر استوار کریں تو وہی عزت و نصرت ہمارا مقدر بن سکتی جس سے وہ سرفراز ہوئے تھے۔

دعوت و تربیت کی تین بنیادیں

۱۔ ایمانِ کامل :- کامل و مضبوط ایمان کی یہی خصوصیت تھی جس کے باعث وہ دعوتِ حق کے اصلی نصب العین سے وابستہ ہوئے۔ اِس ایک وابستگی نے انہیں باقی تمام وابستگیوں سے بے نیاز و بیگانہ کر دیا۔ باقی سارے اہداف ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے ۔ صرف غلبۂ دین ہی ان کا حقیقی ہدف رہا۔ انہوں نے ایک پکارنے والے کی پکار سُنی تو اُس پکار پر لبیک کہتے ہوئے اُدھر لپک پڑے ۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہ اُن کا شعار، اُن کا نعرہ اور ان کی پہچان بن گئی ۔ ہر دوسرے مقصد سے کٹ کر وہ اسی مقصدِ عظیم کے ہو رہے اور اِس مقصد سے ہٹ کر ہر چیز ان کی نظر میں ہیچ اور بے وقعت قرار پائی ۔ ہدایت و گمراہی کا ایک نیا پیمانہ اُن کے ہاتھ آیا ۔ جس کی روشنی میں مشرکینِ مکہ ضلالت و گمراہی پر نظر آ رہے تھے ۔ کیونکہ وہ سچے خدا کے سامنے کچھ دوسری خود ساختہ ہستیوں کو خدا بنائے ہوئے تھے ۔ اہلِ فارس اِس لیے بدراہ تھے کیونکہ وہ اپنی خواہشاتِ نفس کی پرستش میں مصروف تھے ۔ اہلِ کتاب اس لیے راستی سے ہٹے ہوئے تھے کیونکہ انہوں نے اپنے مذہب کے مولویوں اور پیروں کو اللہ کی جگہ معبود و پیشوا بنا لیا تھا ۔ ساری زمین صلاح، ہدایت اور صراطِ مستقیم سے پھری ہوئی تھی ۔ کیونکہ زمین والے زندگی کے اُمور میں اللہ کی ہدایت کے پابند نہیں تھے ۔ اور اپنی راہِ حیات کو اپنے رب کے بخشے ہوئے نور سے روشن نہیں کرتے تھے ...... لیکن یہ گروہِ حق!!! اِس سے تعلق رکھنے والے ہر فرد نے حق سے رشتہ جوڑ کر، بُت پرستی، نفس اور شہوات کی غلامی سے چھٹکارا پا لیا تھا ۔ اپنا

سب کچھ اللہ کی رضا کی خاطر اس کے سپرد کر دیا تھا۔ وہ سوائے اللہ کے کسی کی عبادت نہیں کرتے تھے۔ کسی اور کے سامنے نہ گردن جھکاتے، نہ جبینِ نیاز ٹیکتے تھے۔ اللہ سے بڑھ کر انہیں کسی پر بھروسہ نہیں تھا۔ اس لیے سوال کرتے تو صرف اللہ ہی سے کرتے تھے۔ اللہ کی محبت سے بڑھ کر اُن کے لیے کوئی سامانِ لطف و لذت نہیں تھا۔ جب کبھی غمزدہ اور رنجیدہ ہوتے تو اِس کا سبب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اُن سے کوئی خطا سرزد ہوگئی ہوتی، انہیں یہ احساس رنج اور دُکھ میں مبتلا کر دیتا تھا کہ جس خطا کا ارتکاب اُن سے ہوا ہے، اس کے سبب وہ اپنے اللہ سے دُور ہو جائیں گے۔ تین عوامل میں سے یہ پہلا عامل —— ایمانِ کامل —— تھا، جو ان کی زندگیوں میں غالب انداز میں کارفرما تھا۔ ایمان ہی ان کا نسب اور ان کی شناخت تھا۔ بقول شاعر

ؔ أبي الاسلام، لا أب سواه
إذا افتخروا بقيس أو تميم

(کوئی قیس و تمیم سے نسب پر فخر کرتا ہے تو کرتا رہے، میں نے تو اسلام ہی کو اپنے باپ کا درجہ دے لیا ہے۔ اِس کے سوا میرا کوئی نسب نہیں۔)

یاد رکھو، زمین اللہ کی ہے، وہ جسے چاہتا ہے اِس کا وارث بناتا ہے۔ انجام کی بھلائی صرف اس کا خوف رکھنے اور اُس سے ڈر کر رہنے والوں کے لیے ہے۔ باقی سارے فرق انسانیت کو پارہ پارہ کرنے اور دلوں میں بُعد اور نفرت پیدا کرنے والے ہیں۔ سو اُن اللہ والوں نے رنگ و نسل اور دیگر رنگوں کو مٹا کر اپنے اُوپر ایمان کا رنگ چڑھا لیا تھا۔

ب —— باہمی محبت و اخوت: اُس گروہِ مقدس میں نسب و مراتب اور اموال و اسباب کے لحاظ سے کچھ فرق تھے۔ لیکن ایمان کی بُنیاد پر دلوں کے جڑنے، اللہ کے لیے محبت، روحانی اُلفت، جذباتی لگاؤ اور باہمی اتحاد و وحدت نے ان کے اندر رُتبوں، منصبوں اور القاب و اعزازات کی تفاوت ختم کر دی۔ اِس نوعیت کے فرق و تفاوت کی موجودگی نے ان کے دلوں کو ایک دوسرے سے دُور نہ ہونے دیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ "اللہ کے نزدیک بلند مرتبت وہی ہے جو تقوٰی کے لحاظ سے سب سے بلند ہے۔" چنانچہ تفرقہ کو جنم دینے والے

عوامل اُن کی وحدت کو متاثر نہ کر سکے۔ اُن کے سامنے ایک ہی تصور و تعلیم تھی جو اُن کے خون کی گردش کا حصہ بن گئی تھی کہ اکٹھے ہو جاؤ، وحدت و اتحاد کی لڑی میں اپنے آپ کو پرو لو اور اللہ کی محبت اور اُس کے دین کی نسبت سے اپنے اندر اخوت اجاگر کرو اور آگے بڑھو۔ اُن میں سے کوئی بھی اپنے دوسرے مسلمان کو حقیر نہیں سمجھتا تھا۔ اُن کی باہمی محبت باقی ہر نسبت سے فزوں و فائق تھی۔ ایسی محبت جو ایثار و ترجیح کے اُونچے درجے پر پہنچی ہوئی تھی۔ "یہ (انصار) اُن لوگوں سے محبت کرتے ہیں جو ہجرت کر کے اُن کے پاس آئے ہیں، اور جو کچھ بھی اُن کو دے دیا جائے اُس کی کوئی حاجت تک یہ اپنے دلوں میں محسوس نہیں کرتے اور اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں" (حشر ۹)

محبت و تعلق کا جو معیار قرآن نے اِنہیں دیا ہے اُسے پیشِ نظر رکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ خونی رشتے بھی اگر ایمانی تعلق سے عاری ہوں تو اسلام کی نگاہ میں بے معنی ٹھہرتے ہیں۔ "اے نبیؐ، کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز و اقارب اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور تمہارے وہ کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے اور تمہارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں، تم کو اللہ اور اُس کے رسولؐ اور اس کی راہ میں جہاد سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے اور اللہ فاسق لوگوں کی رہنمائی نہیں کرتا" (التوبہ ـ ۲۴)

ترک و ایثار اور بے نیازی کی کیفیت نے اُن کے اندر ایسا گھر کر لیا تھا کہ اِس جذبے کی روح کو پا لینے کے بعد اللہ کی خاطر ہر چیز کی محبت انہوں نے دلوں سے نکال دی تھی، اور اپنی ہر متاع اللہ کے لیے پیش کر دی تھی۔ یہاں تک کہ مالِ غنیمت سے کوئی چیز لینا اللہ نے اُن کے لیے حلال کر رکھا تھا، لیکن پھر بھی وہ اِس مال کی محبت سے مغلوب ہو کر اس پر حریصانہ لپکنا اور لے اُڑنا منافیٔ ایثار تصور کرتے تھے۔ قیمتی سے قیمتی چیز بھی ہاتھ آجاتی تو از خود سنبھال لینے سے گریز و انکار کرتے تھے۔ اللہ کی رضا کی خاطر وہ اِن مادی چیزوں سے دست کش ہو کر اطمینان و فخر محسوس کرتے تھے اور اُن کے اعمال اور رویوں کے

اندر حرص وطمع کا شائبہ تک نہ ہوتا تھا۔

یہی تین عوامل تھے جنہوں نے اُنہیں عرفانِ حق اور محبت الٰہی کے سوا ہر چیز سے کٹ جانے اور چھوڑ بیٹھنے کے قابل بنا دیا تھا۔ اور اُن کے دل باہمی محبت وا خوت کے جذبے سے مربوط ہو گئے تھے۔ وہ ایثار و قربانی کے ایسے جذبے سے سرشار ہوئے کہ اپنی جانیں اور مال اللہ کی راہ میں پیش کرنا اُن کے لیے بڑا آسان ہو گیا اور اُن کا حال یہ ہوا کہ اجتماعیت و وحدت کی اس رُوح نے انہیں ذلت سے نکالا، عزت سے سرفراز کیا۔ ٹکڑے ٹکڑے تھے، اتحاد کی لڑی میں انہیں پرو دیا۔ جہالت کی تاریکیوں سے نکال کر اُنہیں علم و معرفت کی روشنی میں لا کھڑا کیا۔ یہاں تک کہ وہ پوری انسانیت کے لیے مینارۂ نُور ثابت ہوئے اور آخرت میں اللہ یقیناً انہیں جنت کے دُولہے بنائے گا۔

برادرانِ محترم! نماز کی صف ترتیب دینے اور نماز کے لیے کھڑے ہوتے وقت جب میں نے آپ پر ایک نظر ڈالی تو یہی احساس و خیال تھا جو میرے قلب و ذہن پر چھا گیا۔ یہی کیفیات آپ سے مخاطب ہوتے وقت مجھ پر طاری تھیں۔

میں اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتا ہوں کہ وہ ہم میں اُن اسلاف کے سچّے پیرو اور وارث پیدا فرمائے۔ ہم میں خالص اللہ کے لیے دُنیا کی ہر ایک چیز سے دست بردار ہو جانے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ ہم اللہ سے سچی محبت کرنے اور اُس کے کلمے پر جمع ہونے والوں میں شمار ہوں۔ ہم اپنے ان اسلاف کی مانند ہو جائیں جو ایک نصب العین پر جمع ہوئے اور انہوں نے اللہ کی رضا کے لیے اپنا سب کچھ نچھاور کر دیا تھا۔ اے اللہ، ہم اپنے بزرگوں کے مثل بننے کی تمنا کرتے ہیں تو ہمیں ویسا بنا دے۔ آمین!

تصحیح شمارہ ستمبر

۱۔ ص $\frac{۲۲}{۳۴}$ کی سطر ۱۳ کے شروع میں "عورت" کے بجائے "دو عورتوں" ہونا چاہیے۔

۲۔ ص $\frac{۵۶}{۵۶}$ ۔ آخری سطر۔ "اعبات" کی جگہ "احباب" ہونا چاہیے۔

(ادارہ)

اِسلام میں عورت کی شہادت

محترمہ اُمِّ حسن صاحبہ - منصورہ - لاہور

(۳)

تنہا عورتوں کی شہادت

رہے وہ معاملات جن میں عورت شب و روز لگی رہتی ہے اور جو اس کے ذوقِ مزاج اور رجحان سے پوری طرح مطابقت رکھتے ہیں۔ ان میں شریعت نے اس کی گواہی کو مرد کی گواہی کی طرح مکمل اور پورا شمار کیا ہے۔ بلکہ امام شعبی نے تو یہاں تک کہا ہے:

"مِنَ الشَّهَادَةِ مَا لَا يَجُوْزُ فِيْهِ إِلَّا شَهَادَةُ النِّسَاءِ"
یعنی شہادت کی بعض ایسی قسمیں ہیں جن میں صرف عورتوں ہی کی شہادت جائز ہے۔"

اس مسئلہ میں امام زُہریؒ کا بیان ہے کہ:

"سنت یہ رہی ہے کہ صرف عورتوں کی شہادت ان معاملات میں جائز ہے جن سے عورتوں کے علاوہ کوئی دوسرا واقف نہیں ہوتا یعنی بچے کی ولادت یا اُن کے عیوب وغیرہ۔"

دوسرے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ عورتوں سے مخصوص معاملات میں صرف عورتوں ہی کی شہادت معتبر ہے۔ وہاں مرد کی گواہی کی ضرورت ہے نہ افادیت، انہی کی گواہی پر شریعت کے احکام نافذ ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر بچہ زندہ پیدا ہونے کی شہادت دی گئی، تو پھر اس کی نمازِ جنازہ بھی پڑھی جائے گی۔ اِس کے متعلق احکامِ وراثت پر بھی عمل ہوگا،

ورنہ نہیں، یا یہ مسئلہ کہ عورت باکرہ ہے یا نہیں، بالغ ہے یا نابالغ، ان کی امراض کی شہادت وغیرہ۔ حمل کی مدت کا تعین، گورنمنٹ یا پرائیویٹ ملازم عورتیں، عورتوں ہی کی شہادت (سرٹیفیکیٹ) کی بنا پر رخصت کا حق حاصل کرتی ہیں۔

البتہ اس بات میں فقہاء کا اختلاف موجود ہے کہ عورتوں کے مخصوص مسائل میں بھی کتنی عورتوں کی شہادت ضروری ہے۔ امام مالکؒ دو عورتوں کی شہادت کے قائل ہیں جبکہ بعض فقہاء چار عورتوں کی شہادت کے قائل ہیں۔ امام ثوری اور احناف کے نزدیک ایک عورت ہی کی شہادت کافی ہے۔ احناف اس بات کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ عورتوں کے پوشیدہ مقامات کو دیکھنے میں جتنی قباحت مردوں کے لیے ہے اتنی ہی قباحت ایک عورت کے مقابلے میں زیادہ عورتوں کے معائنہ کرنے میں بھی ہے لہٰذا ایک عورت کی گواہی کافی ہونا ہی مصلحت کا تقاضا ہے۔

علاوہ ازیں جہاں حالات تقاضا کرتے ہوں وہاں عام معاملات میں بھی ایک عورت کی شہادت قرائن کی موجودگی میں قبول کی جائے گی۔ مثلاً حضرت معاویہؓ کے متعلق مروی ہے کہ انہوں نے صرف حضرت اُم سلمہؓ کی شہادت پر ایک مکان کے متعلق جھگڑے کا فیصلہ کر دیا۔ (”عورت اسلامی معاشرہ میں“ ص ۱۸۷۔ از جلال الدین عمری)

اصل مسئلہ یہ ہے کہ کسی واقعہ کا فیصلہ صرف ایک یا دو آدمیوں کی زبانی شہادت ہی پر موقوف نہیں ہوتا بلکہ بہت سے داخلی اور خارجی قرائن اور علامات ایسے ہوتے ہیں جو اصل حقیقت کی وضاحت کر رہے ہوتے ہیں۔ مگر یہ علامات بہرحال دوٹوک اور قطعی نہیں ہو سکتیں۔ کیونکہ شریعت نے فیصلہ کی بنیاد انسانوں کی قطعی اور دوٹوک گواہی پر ہی رکھی ہے۔ البتہ بعض مخصوص معاملات کے سوا عام حالات میں ان علامات کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ اگر یہ علامات کہیں واضح شکل میں موجود ہوں یا احتیاط اور تقویٰ ایک خاص طرح کے فیصلہ کا تقاضا کر رہے ہوں تو شریعت نے صرف ایک گواہ کو بھی کافی سمجھا ہے۔ چنانچہ امام زہری سے روایت ہے کہ تین مختلف گھرانوں میں شادی بیاہ کے ذریعے رشتہ قائم ہوا تو ایک عورت حضرت عثمانؓ کے پاس آئی اور اس نے کہا یہ سب میری رضاعی اولاد

ہیں اور میں نے ان کو دودھ پلایا ہے۔ حضرت عثمانؓ نے اس کی شہادت کی بنا پر ان کے نکاح فسخ کرادیئے۔

روایتِ حدیث کے سلسلہ میں عورت پر اعتماد عورتوں سے جو احادیث مروی ہیں خواہ وہ زندگی کے کسی شعبہ سے متعلق ہوں، تمام علماء و فقہاء امت نے ان پر کُلی اعتماد کیا ہے۔ اور روایات کے سلسلے میں مردوں عورتوں کا فرق کئے بغیر ان کو یکساں اہمیت دی ہے۔ بعض بعض احادیث ہم تک ایسی سندوں سے پہنچی ہیں جن میں کئی کئی خواتین موجود ہیں۔ خود امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، امام ترمذیؒ نے ایسی بہت سی روایتیں قبول کی ہیں جن کی سندوں میں دو دو، تین تین خواتین کا ذکر ہے۔ کیا یہ عورتوں پر اعتماد کی دلیل نہیں ہے۔ اسی طرح رواۃ حدیث کے متعلق عورتوں نے جو جرح و تعدیل کی ہے اس کو تسلیم کیا۔ اور ان کی رائے کے مطابق کسی راویٔ حدیث کی روایات کو قبول یا ردّ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

شریعت کا عورت پر اعتماد ان امور سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شریعت عورت پر کُلی اعتماد کرتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ایک حدیث روایت کرتے وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ انتہائی عقیدت و احترام کا جذبہ ان میں غفلت یا بے توجہی کرنے سے انسان کو بچا لیتا ہے۔ اور آدمی پوری شعوری کوشش سے ان کو ضبط کرتا ہے۔ جب کہ یہ نفسیاتی کیفیت روایت کے سلسلہ میں تو موجود ہوتی ہے۔ مگر عام معاملات میں نہیں ہوتی۔ لہٰذا شریعت نے روایت اور شہادت میں خود فرق قائم رکھا ہے۔ یعنی جن امور میں عورت براہ راست متعلق ہوتی ہے، وہاں ایک عورت کی شہادت کافی ہے۔ اور جو چیزیں اس کے دائرۂ کار سے باہر ہیں وہاں دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کے برابر قرار دی گئی ہے۔ چنانچہ ابن رُشد اپنی کتاب "بدایۃ المجتہد" میں لکھتے ہیں "آئمہ اربعہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مالی معاملات میں ایک عادل مرد اور دو عادل عورتوں کی گواہی معتبر ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتَانِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ کے مطابق: بدایۃ المجتہد جلد ۲ ص ۴۶۵۔

شہادت کے متعلق تفصیلات قرآن مجید نے عورت کی شہادت کے سلسلہ میں جو الفاظ

استعمال کئے ہیں " فَرَجُلٌ وَّ امْرَاَتَانِ " اور اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى
ان سے کئی ایک سوالات پیدا ہوتے ہیں جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ وہ فقہ کی کتابوں
میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ البتہ ایک دو باتوں کا ذکر ضروری ہے۔
۱۔ تنہا عورتوں کی گواہی: بعض فقہا عورتوں کے مخصوص مسائل میں اور قرائن کے ساتھ عام مسائل میں بھی تنہا عورت کی گواہی کے قائل ہیں، جیسا کہ اُوپر تفصیلاً بیان کیا جاچکا ہے۔

۲۔ مشترکہ گواہی: بعض فقہا وہ ہیں جو صرف مالی معاملات میں ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی یعنی مشترکہ گواہی کے قائل ہیں۔ مثلاً امام مالکؒ اور امام شافعیؒ، جب کہ بعض فقہا حدود و قصاص کے علاوہ ہر معاملہ میں مرد و عورت کی مشترکہ گواہی قبول کرتے ہیں۔

۳۔ شہادت کی ایک تیسری قسم وہ ہے جسے حدود و قصاص کہا جاتا ہے، جس میں کچھ فقہا اس بات کے قائل ہیں کہ حدود و قصاص میں عورت کی گواہی سرے سے تسلیم ہی نہیں ہے، جبکہ بعض دوسرے فقہا کہتے ہیں کہ جب عورت کے سہو و نسیان کی کمی دو عورتوں کی شہادت سے پوری کر دی گئی تو پھر ہر مسئلہ میں عورت کو گواہی کا حق ملنا چاہیے۔ علامہ ابنِ حزمؒ اور علامہ ابن قیمؒ جیسے بزرگوں کی رائے ہے کہ اسلام ہر معاملہ میں شہادتِ نسواں کو جائز سمجھتا ہے۔ البتہ ان کی یہ رائے ضرور ہے کہ جن اُمور کا تعلق براہ راست مرد کی عملی زندگی سے ہے اور جو عورت کے دائرہ کار سے خارج ہیں تو اُن کے متعلق اس کی شہادت میں سہو و نسیان کا زیادہ امکان ہے۔ قتل، زنا، چوری، تہمت تراشی، ڈکیتی وغیرہ یہ سب جرائم بڑے سنگین اور بھیانک ہیں، ایک طرف شریعت نے ان کی معین سزائیں رکھی ہیں جن میں حاکمِ وقت اپنی طرف سے کوئی تبدیلی کرنے کا مجاز نہیں۔ دوم یہ سزا پانے کے بعد آدمی اگر زندہ رہ بھی جائے تب بھی معاشرہ میں اس کا وقار بُری طرح مجروح ہوتا ہے۔ اور عزت و احترام جاتا رہتا ہے۔ اس لیے ان کا فیصلہ یقینِ کامل کی بنا پر ہونا چاہیے۔ دوسری طرف عورت کی پوزیشن یہی ہے کہ وہ گھر کی مالکہ ہے، ایک خاص ماحول میں اس کی پرورش اور تربیت ہوتی ہے۔ اُسے ان حالات اور اسباب سے کم ہی واسطہ پیش آتا ہے، جن میں یہ بھیانک جرائم سرزد ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کے معاملہ میں

اس کا مشاہدہ اتنا مکمل اور درست نہیں ہوتا جتنا مرد کا ہوتا ہے۔ اپنے مزاج کی نرمی اور احساسِ شدّت کی بنا پر قتل، چوری، ڈکیتی جیسے جرائم کا تمام جزئیات کے ساتھ مشاہدہ کرنا، پھر اس کو بلاکم وکاست یاد رکھنا اور من وعن عدالت میں بیان کرنا اس کے لیے آسان نہیں ہے، لہٰذا حدود وقصاص کے ضمن میں اُمت کے اس کی گواہی کی حوصلہ شکنی کی ہے، مگر جہاں صرف عورتیں ہی گواہ ہیں اور مقدمہ قتل یا چوری کا ہے، وہاں اُمت میں تنہا عورتوں ہی کی شہادت پر فیصلے کرنے کی نظیریں بھی موجود ہیں۔ مگر یاد رہے کہ آیت شہادت میں قرآن کے الفاظ میں اِنْ لَّمْ یَکُوْنَا رَجُلَیْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ کہ جہاں دو مرد نہ ہوں وہاں بغرض سہولت دو عورتوں کا متبادل انتظام کر لیا جائے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دو مردوں کے ہوتے ہوئے عورتوں کو زحمت دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ لہٰذا ان شاذ نظیروں (جن کی رُو سے تنہا عورتوں کی شہادت پر ضرورت اور حالات کے مطابق فیصلے ہوئے) کو عموم کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ کیونکہ اس طرح عورتوں کی گھروں سے باہر آمدورفت بڑھ جائے گی۔ جو اپنے اندر بے شمار مفاسد لیے ہوئے ہے، لہٰذا اسلام کا تقاضا یہی ہے کہ ان کا ضرورت کے بغیر گھر سے باہر نکلنے کا دائرہ کم سے کم کیا جائے۔

سابقہ بحث میں اسلام کے قانونِ شہادت میں عورت کے مقام ومرتبہ کا تعین کر لیا گیا ہے اور مقامِ شکر ہے کہ پاکستان میں بسنے والی عورتوں کی اکثریت اسلامی قانونِ شہادت پر مطمئن اور راضی ہے۔ قرآنِ پاک میں ارشادِ ربانی ہے: اَفَحُکْمَ الْجَاھِلِیَّۃِ یَبْغُوْنَ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰہِ حُکْمًا لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ (مائدہ ۵ - ۵۰) کیا یہ لوگ جاہلیت کا قانون تلاش کرتے ہیں؟ یقین رکھنے والے لوگوں کے لیے اللہ کے قانون سے بڑھ کر کس کا قانون اچھا ہوسکتا ہے۔

قانونِ الٰہی نہ ماننے والوں کا انجام

قانونِ اسلامی اپنے اندر بے شمار حکمتیں رکھتا ہے۔ مولانا محمد شفیع صاحب لکھتے ہیں:

"حق تعالیٰ نے جن چیزوں کو حرام وممنوع قرار دیا ہے وہ پوری انسانیت کے مفاد کی خاطر اور حکمت پر مبنی ہے۔ اس کی وجہ بخل یا اللہ کا

کوئی ذاتی فائدہ تو نہیں ہو سکتا کہ وہ ان چیزوں کو اپنے کسی فائدہ کی خاطر روکنا چاہتا ہو، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ علیم و خبیر اور حکیم ہے۔ اس کا کوئی حکم فضول اور بے فائدہ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ جن چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے وہ لا محالہ انسان اور انسانیت کے لیے ضرر رساں ہیں۔ اگر ان میں کوئی نفع محسوس بھی ہو تو مضرت کا پہلو بہر حال نفع پر غالب ہو گا۔"

مندرجہ بالا اقتباس سے ثابت ہوتا ہے کہ عورتوں کی شہادت کو مرد کے مقابلے میں آدھا قرار دینا بھی اپنے اندر بے پناہ حکمتیں رکھتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ انسانی فہم اس کا احاطہ نہ کر سکے۔ بہر حال ہمارے لیے برضا و رغبت اس کو ماننا اور بشرحِ صدر اسے قبول کرنا لازمی ہے۔ جیسا کہ ارشادِ خداوندی ہے:

مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا۔ ( )

"جب اللہ اور رسول کسی معاملہ کا فیصلہ کر دیں تو پھر کسی مومن مرد یا عورت کا یہ کام نہیں کہ وہ اپنا اختیار استعمال کرے اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے۔ وہ بہت زیادہ گمراہ ہو گیا۔"

شریعتِ الٰہی کے مَن پسند احکام کو مان لینا اور جو ناگوار گذریں ان کو چھوڑ دینا یا ان کے متعلق تاویلیں کرنا اللہ اور رسول پر ایمان کے منافی ہے۔ اہلِ ایمان کا معیار یہی ہے کہ وہ کس حد تک خدا اور رسولؐ کے احکام کا پابند ہے۔ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے:

لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ

"ترجمہ: تم میں سے کوئی اہلِ ایمان ہو نہیں سکتا جب تک اس کی اپنی خواہشات میری لائی ہوئی تعلیم کے تابع اور ماتحت نہیں ہو جاتیں۔" (باقی)

انعام اللہ شہیدؒ

(ابن جسٹس ملک غلام علی)

جناب حافظ محمد ادریس صاحب

افغانستان کی سرزمین پر چودہ لاکھ کلمہ گو مرد، عورتیں، بچے اور بوڑھے ظلم و بربریت کے خلاف جہاد کرتے ہوئے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کر چکے ہیں۔ ان شہداء کی اس عظیم الشان اور عدیم المثال قربانی کی بدولت اللہ رب العزت نے نہتے افغانوں کو دنیا کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ سنگدل فوجی قوت کے مقابلے میں تاریخی فتح عطا فرمائی ہے۔ اس عظیم جہاد میں عظیم افغانی قوم کے شانہ بشانہ دنیا بھر سے شمع رسالت کے پروانے داد شجاعت دیتے رہے ہیں۔ ان غیر افغان مجاہدین کی شرکت جہاد جہاں ان کے اپنے لیئے عظیم سعادت ہے وہاں اہل دنیا کے لیئے بھی سامان عبرت ہے کہ یہ جنگ کسی نسلی یا علاقائی تعصب کی بنیاد پر نہیں لڑی گئی بلکہ اسے معرکہ حق و باطل سمجھ کر فرزندانِ توحید نے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کیے ہیں۔

لاکھوں افغان شہداء کے سعادت مند قافلوں کے ساتھ پاکستانی، سعودی، ترک، مصری، الجزائری، فلپائنی، کویتی، مراکشی اور دیگر ممالک کے شہداء بھی شامل ہو چکے ہیں۔ جنگ اب تک جاری ہے اور قربانیاں دینے والے سروں سے کفن باندھے جوق در جوق مجاہدین کی صفوں میں شامل ہو رہے ہیں۔ بہت سے پاکستانی جوان جذبۂ شہادت سے سرشار میدان جہاد میں اترے اور جام شہادت پی کر سرخرو ہو گئے۔ قرآن مجید کے الفاظ ہیں "مومنین میں ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو سچ کر دکھایا ہے۔ ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا

ہے اور وقت آنے کا منتظر ہے ۔" (الاحزاب ۔۲۳)

۲۴ ر اگست ۱۹۸۹ کو صبح دس بجے کے قریب جماعت اسلامی کے مرکز منصورہ میں پشاور سے ہمارے عزیز بھائی شبیر احمد صاحب نے محترم چوہدری محمد اسلم سلیمی صاحب (قیم جماعت اسلامی پاکستان) کو فون پر اطلاع دی کہ منصورہ کا بطل جلیل، مجاہد عظیم انعام اللہ ملک پروان کے محاذ پر ۲۰ ر اگست کو شہید ہو گیا تھا اور شہید کی تحریری وصیت کے مطابق اسے جائے شہادت پر شہدا کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا ہے۔ انعام اللہ شہید ملک غلام علی صاحب سابق جسٹس وفاقی شرعی عدالت پاکستان کا نور نظر تھا۔ نہایت سنجیدہ، ہونہار، بہادر اور صالح ۔ یہ نوجوان منصورہ کا مثالی کردار تھا۔ جہاد پر گیا تو پھر وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ کبھی کبھار واپس آتا تو یہاں بھی اس کا موضوع جہاد ہی ہوتا۔ جہاد اس کا اوڑھنا بچھونا تھا اور شہادت اس کی آرزو۔ اس آرزو کا وہ اتنی بار اظہار کر چکا تھا۔ زبانی بھی اور تحریری بھی۔ کہ اسے دیکھ کر بے ساختہ قرون اولیٰ کے مجاہدین صف شکن کی یاد تازہ ہو جاتی تھی ۔ اب وہ اپنی منزل کو پا چکا ہے۔

ملک صاحب کو جب ان کے جوان ہمت وجوان سال بیٹے کی شہادت کی اطلاع دی گئی تو ملک صاحب نے "صبر جمیل" کا یادگار نمونہ پیش کیا۔ اس عظیم انسان کی عظمت ہمیشہ میرے دل میں موجزن رہی تھی مگر آج میں نے محسوس کیا کہ یہ اس مقام سے کہیں عظیم تر انسان ہے جو مقام میں نے اس کے بارے میں اپنے دل میں متعین کر رکھا تھا اور جسے میں بلند و بالا مقام سمجھتا تھا۔

ملک صاحب کے وہ الفاظ جو صدمۂ اولیٰ کے وقت آپ کی زبان پر آ گئے تھے مجھے کبھی نہیں بھول سکتے۔ فرمایا "میرے بیٹے کی تمنا تھی کہ اسے شہادت کا رتبہ مل جائے سو اس نے یہ رتبہ پا لیا۔ اللہ اس قربانی کو قبول فرمائے۔ ۔ ۔ جہاں جہاد افغانستان میں لاکھوں مسلمان شہید ہوئے ہیں وہاں اللہ نے ہمیں بھی یہ سعادت عطا فرمائی کہ ہمارا بھی اس قربانی میں حصہ قبول فرما لیا۔"

انعام اللہ شہید تیس سال کا نوجوان تھا۔ چہرے پر لمبی سیاہ خوبصورت داڑھی دیکھ

کر یوں ہی لگتا تھا جیسے کوئی افغان مجاہد ہو۔ انعام اللہ شہید سے میری زیادہ ملاقاتیں نہیں ہوئیں۔ گذشتہ سال ماہ رمضان میں ملک غلام علی صاحب شدید بیمار ہوئے تو منصورہ ہسپتال میں داخل کروا دیئے گئے۔ یہیں انعام اللہ سے ملاقاتیں ہوئیں ۔ وہ جہاد سے واپس آیا ہوا تھا اور اپنے والد گرامی کی خدمت میں دن رات حاضر رہتا تھا۔ کتنا عظیم مسلمان تھا اور کتنا سعادت مند بیٹا۔

کچھ عرصہ قبل میں نے ملک صاحب کی خدمت میں "معجزات سرور عالم" پیش کی تھی۔ انعام جہاد پر جاتے سے قبل وہ کتاب اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اسلامی موضوعات پر کتابیں پڑھنے کا بھی اسے اسی طرح شوق تھا جس طرح جہاد میں حصہ لینے کی لگن تھی۔ انعام اللہ کا ذوقِ مطالعہ قابلِ رشک تھا۔ بعد میں اس کے ساتھیوں اور شاگردوں سے معلوم ہوا کہ وہ بہت اچھے انداز میں درسِ قرآن بھی دیا کرتا تھا۔ قرآن وحدیث کے علاوہ اسلامی تاریخ اور غزوات اس کے پسندیدہ موضوعات تھے۔ ملک صاحب ہسپتال سے فارغ ہو کر گھر آئے تو انعام اللہ جہاد پر جانے کے لیے بے قرار ہو گیا۔ انہی دنوں میں نے ایک شام انعام اللہ کو جامع منصورہ میں دیکھا۔ مغرب کی جماعت ہو چکی تھی۔ میں نے دیکھا کہ انعام اللہ نماز کی نیت باندھے یوں کھڑا تھا جیسے حدیث نبوی کے مطابق صلوٰۃ مودّع ادا کر رہا ہو۔ اس کے چند ہی دنوں بعد انعام اللہ افغانستان جا چکا تھا۔ اس مرتبہ بھی اس نے اپنے مختلف خطوط میں اپنے والدین اور عزیزوں کے نام یہ پیغام بھیجا تھا کہ شہادت کی تمنا مچل رہی ہے۔ اس مرتبہ وہ شہادت سے ہمکنار ہو کر اپنی تمنا پوری کر گیا۔

؎ "شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن"

افغانستان کی جنگ صحیح معنوں میں جہادِ اسلامی ہے۔ جنگ لڑنے والے کسی عصبیت کی بنا پر نہیں بلکہ غلبۂ حق کے لیے اپنی جانیں نچھاور کر رہے ہیں۔ یہ فوج گلبدین حکمت یار، یا یونس خالص یا پروفیسر برہان الدین ربانی یا پروفیسر سیاف یا کسی دوسرے افغان لیڈر کی فوج نہیں بلکہ یہ فوج محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی فوج ہے جو تاریخ میں بار بار نمودار ہوتی رہی ہے۔ شاعرِ اسلام علامہ محمد اقبالؒ کے الفاظ میں:

سے "سالارِ کارواں ہے میرِ حجاز اپنا

انعام اللہ خوش قسمت تھا کہ میرِ حجاز کی فوج میں شامل ہوا اور شہدائے بدر و احد کے قدموں میں جا پہنچا۔

انعام شہید کے بارے میں بارہا یہ کہا گیا کہ وہ بلا خوف و تردد خطرات میں کود پڑتے تھے مجھے اس ضمن میں جنگ مؤتہ کے واقعات یاد آرہے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے جانثاروں کو مدینہ سے رخصت کیا تو فرمایا "فوجوں کے کمانڈر زید بن حارثہ ہوں گے۔ اگر انہیں کچھ ہو جائے تو کمان جعفرؓ بن ابی طالب سنبھالیں گے۔ اگر انہیں بھی کچھ ہو جائے تو عبداللہؓ بن رواحہ فوجوں کے قائد ہوں گے اور اگر انہیں بھی کچھ ہو جائے تو پھر مجاہدین جسے چاہیں اپنا کمانڈر بنالیں۔ صحابہ کرامؓ ارشاد نبوی سننے کے بعد اس نتیجے پر پہنچ گئے تھے کہ یہ تینوں کمانڈر درجہ شہادت پا جائیں گے۔ جب لوگوں نے انہیں رخصت کیا تو اسی احساس اور تصور کے ساتھ ان سے گلے ملے کہ گویا وہ شہداء سے معانقہ کر رہے ہیں۔ جب مؤتہ کے میدان میں جانثارانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپہنچے تو معلوم ہوا کہ ان کے تین ہزار (۳۰۰۰) مجاہدین کے مقابلے پر شامی اور رومی فوجوں کی تعداد ایک لاکھ کے قریب ہے۔ زیدؓ بن حارث نے شام کے وقت اپنے خیمے میں صاحب الرائے صحابہؓ کو جمع کیا اور دونوں فوجوں کے اس تفاوت کے تناظر میں ان لوگوں سے مشورہ طلب کیا کہ اب کیا کیا جائے؟۔ عبداللہؓ بن رواحہ نے کھڑے ہو کر پرجوش انداز میں کہا "دوستو ہم دو ہی باتوں کے طلب گار ہیں۔ فتح یا شہادت۔ فکر کس بات کی ہے؟ انشاء اللہ دونوں میں سے ایک چیز ضرور ملے گی"۔ ان کی اس جرأت مندانہ رائے نے سب کو مطمئن کر دیا۔ انعام شہید بھی خطرات میں کودتے وقت یہی بنیادی تصور ذہن میں رکھتا تھا کہ یا دشمن پر غلبہ حاصل ہوگا اور یا شہادت کی آرزو پوری ہوگی۔

شہادت کتنی بڑی نعمت ہے؟ اس کا اندازہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول مبارک سے لگایا جاسکتا ہے۔ "اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے میری تمنا ہے اللہ کی راہ میں جہاد کروں، شہید ہو جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، جہاد کروں

شہید ہو جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، جہاد کروں اور شہید ہو جاؤں"۔

(صحیح بخاری، صحیح مسلم، موطا امام مالک عن ابی ہریرہ)

انعام شہید نے شہادت پا کر اپنے والدین کو خصوصاً اور ہم سب کو عموماً ایک اعزاز اور شرف عطا کیا ہے۔ اس عظیم جہاد میں ہمارا بھی حصہ شامل ہو گیا ہے۔ انعام سرخرو ہو گیا ہے اور اس کے والدین قابل صد مبارک باد ہیں۔ شہادت تو بندۂ مومن کی آرزو ہوتی ہے اور یہ بلند مرتبہ اللہ تعالیٰ کی دین ہے۔

جنگ قادسیہ میں سیدہ خنساءؓ بنت عمرو نے اپنے چار بیٹوں کی قربانی پیش کی اور جب بیٹوں کی شہادت کی خبر ملی تو کہا "اللہ میری قربانی قبول فرما لے اور مجھے جنت میں میرے بیٹوں سے ملا دے۔" انعام شہید کے والدین نے بھی خنساء رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے نقش قدم پر چلتے ہوئے صبر جمیل کا مظاہرہ کیا۔ سچ ہے سلام اس پر کہ جس کے نام لیوا ہر زمانے میں جان فروشی و جان نثاری کی یہ عظیم مثالیں پیش کرتے رہتے ہیں۔

ملک غلام علی صاحب اٹھارہ بیس سال کی عمر میں اس صدی کے عظیم انسان سید مودودیؒ سے متعارف ہوئے اور اسلامی انقلاب کی جدوجہد میں پوری زندگی کھپا دی۔ میں ملک صاحب کو بہت عرصے سے جانتا ہوں۔ زمانہ طالب علمی میں ان کے پاس اچھرہ میں حاضر ہوتا تھا۔ اس وقت ذرا دور سے انہیں دیکھا تھا۔ بعد میں ان کے قریب آنے اور تفصیلی تعارف حاصل کرنے کا موقع ملا۔ میں نے ان کے بارے میں ایک تصور قائم کر رکھا تھا جو خاصا بلند تھا مگر انعام کی شہادت پر مجھے یہ اعتراف کرنا پڑا کہ میرے قائم کیے ہوئے بلند و بالا تصور سے بھی ملک صاحب بلند تر نکلے۔ یہ خدا تعالیٰ کا خاص انعام ہے جو وہ اپنے مخصوص بندوں کے شامل حال کیا کرتا ہے۔

دو سال قبل میرے ایک دوست کینیا سے تشریف لائے۔ میں نے اس موقع پر بعض دوستوں اور بزرگوں کو کھانے پر دعوت دی۔ ملک صاحب بھی کمال شفقت سے غریب خانے پر تشریف لائے۔ جب احباب جا چکے تو میرے دوست نے کہا "یہ بزرگ جو شرعی عدالت کے جج رہ چکے ہیں۔ اللہ والے ہیں کہ ان کو دیکھ کر اللہ کی یاد دل میں

تازہ ہوتی ہے۔ ...،، انعام کی شہادت پہ مجھے اپنے اس دوست کے یہ الفاظ بار بار یاد آئے۔

جہاد افغانستان میں پاکستان کے ہزاروں فرزندانِ توحید نے حصہ لیا اور سینکڑوں نے جامِ شہادت نوش کیا۔ ان میں سے ایک بڑی تعداد اسلامی جمعیت طلبہ اور جمعیت طلبہ عربیہ سے تعلق رکھتی تھی۔ میری درخواست ہے کہ دونوں جمعیتوں کے ذمہ داران اپنے شہداء کی تفصیلات اور ان کے حالات جمع کر کے شائع کریں۔ یہ تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ پاکستان میں جہاد دشمن عناصر تاریخ کو مسخ کر رہے ہیں۔ ہمارے اوپر تاریخ کا یہ قرض ہے کہ ہم آنے والی نسلوں کو اصل حقائق بتائیں۔ افغانستان پر روس کے جارحانہ اور بہیمانہ حملے کے وقت جہاں روس اور ہندوستان کے گماشتوں نے اس جنگ سے لاتعلقی کا اظہار کیا اور پھر مجاہدین کی کامیابیوں کے بعد روس کی حمایت میں سرگرم عمل ہو گئے وہاں اسلام کے شیدائیوں اور محمد عربی کے پریشان حال دیوانوں نے اس جنگ کو اپنی جنگ قرار دیا۔ افغان مجاہدین کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے اور ضرورت پڑی تو جان کے نذرانے بھی پیش کیے۔ یہ جنگ پوری ملت اسلامیہ کی جنگ تھی اور اس میں پوری امت نے حصہ لیا تھا۔ یہ حقیقت دستاویزی ثبوت کے ساتھ اپنے پاکستانی شہداء کے حوالے سے ہمیں تاریخ کے سپرد کر دینی چاہیئے۔

"جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں انہیں مردہ نہ سمجھو، وہ تو حقیقت میں زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس رزق پا رہے ہیں، جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دیا ہے اس پر خوش و خرم ہیں، اور مطمئن ہیں کہ جو اہلِ ایمان ان کے پیچھے دنیا میں رہ گئے ہیں۔ اور ابھی وہاں نہیں پہنچے ہیں ان کے لیے بھی کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔ وہ اللہ کے انعام اور اس کے فضل پہ شادان و فرحان ہیں اور ان کو معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ مومنین کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔" (آل عمران ۱۶۹ – ۱۷۱)

(انعام اللہ شہید کی یاد میں ۳ ستمبر ۱۹۸۹ کو جمعیت طلبہ عربیہ کے زیر اہتمام منعقدہ تقریب میں کی گئی تقریر کے اقتباسات)

رسائل و مسائل

رضاعت کبیر

جناب ملک غلام علی صاحب

سوال پچھلے ماہ کا "اردو ڈائجسٹ" جو کہ اگست کا شمارہ اور شہید پاکستان نمبر تھا اس میں ایک مضمون حضرت عائشہ رضؓ کے نام سے جناب حافظ افروغ حسن نے شائع کروایا۔ اس میں انہوں نے حضرت عائشہ رضؓ کی سیرت طیبہ پر سیر حاصل تبصرہ کیا جو کہ ہم جیسے کم علم لوگوں کے لیے بہت مفید ثابت ہوا، لیکن اس میں جناب حافظ صاحب صفحہ ۵۰ پر تحریر فرماتے ہیں کہ:

"ام المومنین حضرت عائشہ رضؓ کا مسلک تھا کہ اگر ایک بالغ لڑکا کسی عورت کا دودھ پی لے تو اس عورت اور اس کے متعلقین کے ساتھ رضاعت کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ آپ بہت سے لڑکوں کو اپنی بہنوں اور بھانجیوں کا دودھ پلواتی تھیں تاکہ خود ان کی رضاعی خالہ اور نانی بن جائیں۔ اور وہ پردہ کی پابندیوں سے آزاد ہو کر آزادی سے ان کے پاس آ کر کسب فیض کر سکیں۔"

محترمی اس پورے فقرے کی سمجھ نہیں آئی۔ صرف اس کی وضاحت کی خاطر آپ کو تکلیف دے رہا ہوں۔ کیونکہ یہ فقرہ پڑھ کر جو سوالات ذہن میں آتے ہیں ان کی وضاحت ہو سکے۔ کیا بالغ لڑکے کے سامنے سینہ کھولنا اور اسے دودھ پلانا جائز ہو سکتا ہے؟ کیا اس طرح نسبی رشتوں کے مانند احکام جاری ثابت ہو سکتے ہیں۔

جواب: "اردو ڈائجسٹ" شمارہ اگست ۱۹۸۹ء صفحہ نمبر ۵۰ پر شائع شدہ حضرت

حضرت عائشہؓ سے متعلق مضمون کا جو اقتباس آپ نے نقل کیا ہے، اُسے پڑھ کر افسوس ہوا۔ ہماری قدیم کتابوں میں ہر طرح کے واقعات و مباحث درج کر دیئے گئے ہیں، لیکن ان میں سے ہر واقعہ ایسا نہیں ہے جسے جوں کا توں نقل کر دینا آج کے دور میں ضروری یا مفید ہو، بالخصوص ایسے واقعات جن کا فقہی احکام و مسائل سے براہ راست تعلق ہو، ان کے اندراج میں بڑی تحقیق، احتیاط اور چھان بین کی حاجت ہوتی ہے۔ بسا اوقات بلا ضرورت ایک بات مجمل و مبہم طریق پر یوں بیان کر دی جاتی ہے کہ اس میں افادیت کے بجائے اعتراضات و اشکالات کے پہلو نمایاں تر ہو جاتے ہیں۔ آپ نے جو اقتباس دیا ہے، اُس کی بھی میرے نزدیک یہی صورت ہے لہٰذا میں سمجھتا ہوں کہ اُردو ڈائجسٹ جیسے ماہنامے میں یہ مسئلہ مذکور نہ ہوتا تو بہتر تھا۔ بہر کیف میں اس بارے میں اختصار کے ساتھ چند کلمات پیش کرتا ہوں۔

حضرت عائشہؓ کا جو مسلک منقولہ عبارت میں پیش کیا گیا ہے، وہ ان کی جانب منسوب تو کیا جاتا ہے، لیکن کتاب و سنّت کی کسی نصِ قطعی سے اس کی تائید یا جواز فراہم نہیں ہوتا بلکہ قرآن و حدیث کی نصوص اس کے معارض ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جمہور اُمت کی رائے اس مسئلے میں حضرت عائشہؓ سے مختلف ہے۔ اِس سلسلے میں جو واقعہ مولانا سید سلیمان ندوی نے سیرت عائشہؓ ص ۲۳۶ پر بیان فرمایا ہے، وہ درج ذیل ہے:

> حضرت ابو حذیفہؓ صحابی کے ایک نابالغ غلام سالم تھے جو مولی ابو حذیفہؓ کی نسبت سے مشہور ہیں، وہ اپنے آقا کے گھر میں رہتے تھے اور زنانہ میں آمد و رفت رکھتے تھے۔ حضرت ابو حذیفہؓ کی بیوی سہلہ بنت سہیل کا ان سے پردہ نہ تھا۔ جب سالم بالغ ہوئے تو حضرت ابو حذیفہؓ کو اپنی بیوی کا ان سے پردہ نہ کرنا پسند نہ آیا۔ وہ بیوی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض پرداز ہوئیں کہ یارسول اللہ! اب سالم بالغ ہو گئے ہیں، میں سمجھتی ہوں کہ میرا اُن کے سامنے آنا ابو حذیفہؓ کو ناگوار ہے۔ فرمایا: سالم کو اپنا دودھ پلا دو تو ابو حذیفہ کی یہ ناگواری دور ہو جائے گی۔ اس واقعہ کی بنا پر حضرت عائشہ صدیقہؓ کا مسلک یہ تھا کہ بالغ لڑکے کو بھی اگر کسی عورت نے دودھ پلایا تو رضاعت کی حرمت ثابت ہو جائے گی۔ لیکن دیگر ازواجِ مطہرات

نے اس اجازت کو مخصوص حضرت سالمؓ اور حضرت ابو حذیفہؓ کی بیوی کے متعلق سمجھا اور اس حکم کو عام نہیں مانا۔

امام نوویؒ نے بھی صحیح مسلم کی شرح میں اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ تمام صحابہؓ، تابعین اور علمائے امصار نے حضرت عائشہؓ کے مسلک سے اختلاف کرتے ہوئے دو سال اور تین سال کے درمیان کی عمر میں رضاعت سے حرمت کو لازم قرار دیا ہے۔ اس سے زیادہ عمر ہو جانے پر رضاعت سے حرمت جمہور علمائے اُمت کے نزدیک ثابت نہیں ہوتی، نہ اس سے پردے کے احکام تبدیل ہو سکتے ہیں۔

صحیح مسلم، کتاب الرضاع میں خود حضرت عائشہؓ سے ایک صحیح حدیث مروی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ حرمتِ رضاعت صرف شیرخوارگی کی عمر ہی میں دودھ پینے سے واقع ہوتی ہے۔ جب کہ بچہ دودھ کے لیے طلب محسوس کرتا ہے۔ وہ حدیث درج ذیل ہے:

حضرت مسروقؒ حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاں تشریف لائے جب کہ میرے پاس ایک شخص بیٹھے تھے تو میں نے آنحضورؐ کے چہرہ مبارک میں ناراضی کے آثار دیکھے۔ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ یہ میرے رضاعی بھائی ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: انظرن اخوتکن من الرضاعۃ فانما الرضاعۃ من المجاعۃ (اپنے رضاعی بھائیوں کے معاملے میں دیکھ بھال کر لیا کرو! رضاعت فقط دودھ کی فطری بھوک یعنی شیرخوارگی کے زمانے ہی میں ثابت ہوتی ہے)۔

سالم حضرت ابو حذیفہؓ کے منہ بولے بیٹے اور آزاد کردہ غلام تھے۔ ان کی گھر میں آمد و رفت ناگزیر اور بچپن ہی سے جاری تھی، جسے روک دینا عملاً محال و دشوار تھا۔ اس لیے آنحضورؐ نے اس گھرانے کے خاص حالات کے پیش نظر یہ صورت تجویز فرمائی تھی کہ سالم کو حضرت ابو حذیفہؓ کی اہلیہ اپنے دودھ کے چند قطرے پلا دیں۔ اس کے لیے سینہ کھولنا اور جسم کا برہنہ کرنا ضروری نہیں تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ دودھ کی قلیل مقدار کسی شیشی، پیالی وغیرہ میں نچوڑی جائے اور پلا دی جائے۔ چنانچہ امام نوویؒ نے حضرت ابو حذیفہؓ کی اہلیہ حضرت سہلہؓ بنت سہیل کے

بارے میں قاضی عیاض کی بیان کردہ یہی توجیہہ و تاویل شرح مسلم میں نقل فرمائی ہے۔ الفاظ یہ ہیں: قال القاضی لعلہا حلبتہ ثم شربہ من غیر ان یمس ثدیہا ولا التقت بشرتہما وھذا الذی قالہ القاضی حسن (قاضی عیاض کہتے ہیں کہ غالباً ابوحذیفہؓ کی بیوی نے اپنا دودھ نچوڑ لیا ہوگا اور سالم نے اسے پیا ہوگا، بغیر اس کے کہ سینے کو چھوتے یا دونوں کا جسم ایک دوسرے کو مس کرے اور قاضی عیاض کی بیان کردہ توجیہہ پسندیدہ ہے۔

بہرکیف حضرت ابوحذیفہؓ کے گھر والوں کا واقعہ ایک بالکل استثنائی واقعہ ہے۔ یہ کتاب وسنت کے اس محکم ومنصوص اصول میں ترمیم وتنسیخ نہیں کرسکتا کہ حرمتِ رضاعت صرف شیرخوارگی کی عمر ہی میں دودھ پینے سے واقع ہوتی ہے اور پردے اور مناکحت کے احکام اسی سے ثابت ہوتے ہیں۔

مطبوعات

FROM THE BANKS OF HISTORY از جناب محمد امین باجوہ۔ بی۔ ایس۔ سی۔ ناشر فاروق امین باجوہ برادرز " شارکس " کالونی، صادق آباد، ضلع رحیم یار خان۔ سفید کاغذ پر ٹائپ کی بہت خوب صورت طباعت، سادہ، خوشنما اور مضبوط جلد۔ قیمت: نامعلوم۔

اب تک تو ہم سمجھتے تھے کہ باجوہ برادرز کی شارکیس لیبارٹری شاید صرف "شارک" مچھلیاں بناتی[1] ہے۔ اور دریائے تاریخ کے کناروں سے پانی میں پھینک دیتی ہے، مگر اب معلوم ہوا کہ وہ کتابیں بھی بناتی ہے۔ جو شاید شارک مچھلیوں کی غذا کے لیے مناسب ہوں۔ کیونکہ دیمک کے علاوہ، یہ بھیڑیوں کی بھی من پسند خوراک ہے۔ (ص ۔ ۳۰)۔ کتاب کا یہی مصرف بہترین ہے، نیکی کر دریا میں ڈال۔ ورنہ اب کتابیں پڑھنے کا فیشن تو یونیورسٹیوں اور کالجوں سے بھی رخصت ہو رہا ہے، کجا کہ غیر طالب علم لوگ پڑھیں۔ یہاں کا اصول تو اب یہ ہے کہ علموں بس کریں او یار! اب تو کلاشنکوف ہے یا ووٹ یا پلاٹ یا فلیٹ یا وزارت یا مشیری۔ باقی سب ہیر پھیر ہے۔

متذکرہ طویل جملۂ معترضہ کی معافی چاہتا ہوں۔

اِس انگریزی کتاب میں بہت ہی سادہ اور رواں اور دلکش زبان استعمال کی گئی ہے۔ اس میں چند فی صدی آٹو بیا گرافی بھی شامل ہے، مگر حقیقت میں یہ پورے خاندانی قافلے کی اخلاقی، تمدنی اور اقتصادی روداد ہے۔ یہ قافلہ سیالکوٹ سے چل کر ضلع فیصل آباد اور وہاں سے صادق آباد تک پہنچا ہے۔ والدین اور اولادوں کی اور بھائیوں اور بہنوں کی محبتوں کی جگمگاہٹ کے ساتھ اور کہیں کہیں بعض صدمات کی خوں فشاں جراحتوں کے ساتھ جناب محمد امین باجوہ نے خاندان کی تمدنی داستان بیان کرتے ہوئے کبھی کھیتوں کی مٹی میں مٹی ہو جانے کی کاشتکارانہ جہد کا منظر دکھایا ہے، کبھی

---

[1] یہ مجھے معلوم ہے کہ شارکیس کا تلفظ دوسرا ہے: SHAREX-

بابا فتح دین اور بھینسوں کا حال چال بیان کیا ہے۔ کبھی دودھ بلونے کی مٹکی (چاٹی) کے پاس جا پہنچایا ہے جہاں چند لمحوں میں مدھانی مکھن کو لسّی سے الگ کر دیتی ہے۔ کبھی وہ تحریک پاکستان کے وقت کے انسان کُشی کے مناظر دکھاتے ہیں۔ کبھی وہ تعلیمی اور کالجی فضا میں لے جاتے ہیں۔ اور بڑی خوبصورتی سے پہلی بار بیڑی سے شوق فرماتے ہیں۔ پھر ان کی زندگی کا عظیم واقعہ ان کا مع بیگم کے جوانی میں حج پر جانا ہے۔ اس مبارک سفر میں محمد امین باجوہ صاحب کہتے ہیں کہ حج نے میری آنکھیں بھی کھول دیں اور دل کو بھی شرحِ صدر کی کیفیت ملی۔ نتیجۃً میں نے قرآن اور اس کی صداقت کو زیادہ بہتر طور پر سمجھا۔ نئے احساسات کے ساتھ جو دعا انھوں نے مسجد نبوی میں کی وہ انتہائی خلوص و والہیت میں ڈوبی ہوئی ہے۔ (ص ۵۷)۔ پھر تیسرے باب میں بیوی بچوں کے متعلق بہ اندازِ خاص تفصیلات لکھی ہیں۔ بیچ بیچ میں دریائے تاریخ کی موجوں کی کچھ جھلکیاں سامنے آتی جاتی ہیں۔ مثلاً تشکیل پاکستان، بنگلہ دیش کی علیحدگی، شاہ ایران کی شادی فرح دیبا سے۔ شاہ کے تخت و تاج کا ۱۹۷۹ء میں خاتمہ، افغانستان پر رُوس کی جارحیت وغیرہ۔ مسرت کی بات ہے کہ امین باجوہ صاحب کا سفرِ عمر ان کو شروع ہی میں جماعتِ اسلامی میں لے آیا۔ الحمد للہ!

ساری باتیں کہنے کے لیے جگہ نہیں۔ ویسے حقیقتوں کی اس سادہ بیانی کا جو خاص لطف ہے وہ بڑی ادبی نگارشوں اور تحقیقی کاوشوں میں نہیں ملتا۔

فقہ النساء | عربی کتاب از جناب محمد عطیہ خمیس۔ اردو ترجمہ: سیّد شبیر احمد صاحب رکن ادارہ معارف اسلامی، منصورہ، لاہور۔ سفید کاغذ پر کھُلی کھُلی کتابت۔ رنگین مضبوط جلد۔ صفحات ۵۴۴ قیمت: ۹۰/- روپے (مناسب)۔

اسلامی شریعت و فقہ کا ایک بڑا حصہ خواتین سے متعلق مسائل خاص پر مشتمل ہے۔ آخر حصّہ بحساب مساوات۔ مگر اس خاص دائرے میں کتب کی ایسی کمی رہی ہے کہ اس پر خواتین کو احتجاج کرنا چاہیے تھا۔ مگر ادارہ معارف اسلامی نے ان کے احتجاج سے قبل ہی ایک جامع کتاب پیش کر دی ہے۔ مگر اس ضخیم کتاب میں زیادہ تر عبادات خمسہ کے متعلق فقہی احکام و دلائل پیش کیے گئے ہیں ــــ مساوات اور حقوق وغیرہ کی بحثیں نہیں کی گئیں۔ مجموعی طور پر یہ ایک جامع اور

اچھی رہنمائی ہے۔ فاضل مترجم جناب شبیر احمد صاحب عربی اور اُردو دونوں زبانوں کو جانتے اور ترجمہ کاری میں خاص مقام رکھتے ہیں۔ ان کے کیے ہوئے کام میں فی نکالنا بڑی زیادتی ہے۔

مگر فقہی کتابوں میں جب اختلافی استنباط پیش کیے جاتے ہیں تو کبھی کبھی نص اور عقل دونوں کو جمع کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے یہ اختلافات غیر عالم قاری کو پریشان کرتے ہیں اور شریعت دشمن محاذ کے ترکش میں اضافہ کرتے ہیں۔

چند قابلِ توجہ گذارشات:

۱۔ فاضل و محترم مترجم فرماتے ہیں کہ چاروں فقہوں کے احکام بیان کر دیئے گئے ہیں، ان میں سے عورتیں جس معاملے میں جس نقطہ نظر کو چاہیں اختیار کریں۔ ہماری رائے میں یہ مرتبہ اوسط درجے کے عالموں کا ہے کہ وہ مختلف آرا اور استنباطات میں سے کسی کا انتخاب کریں۔ عوامی سطح پر، مرد ہوں یا عورتیں وہ نہ تو پورے سلسلۂ استدلال کو جان سکتے ہیں، نہ احادیث کی صحت کی جانچ کر سکتے ہیں، نہ اصولِ فقہ کو سمجھ کر ان کا انطباق کر سکتے ہیں اور وہ اگر فقہی احکام کو اپنی اپنی پسند پر اس طرح لینے لگیں جیسے مرغیاں دانہ چگتی ہیں تو بڑی مشکل ہوگی۔ فرد فرد الگ الگ راستے پر چل پڑے گا اور اجتماعی عبادات میں ایک عجیب تفرقہ واقع ہوگا۔ نیز آسانیاں جمع کرنے والی قباحت تو ضرور پیش آئے گی۔ اصل میں کسی ایک فقہی حکم کے لیے صرف دلیل کا ہونا اور چیز ہے اور مختلف دلائل و احکام کا مختلف علماء کے تحقیق کردہ جامع اصولِ فقہ کے تحت آنا اور چیز ہے۔ ورنہ اگر ایک معاملے میں ایک اصول (یا دلیل) کو لے کر دوسرے میں اُسے توڑ دیا جائے تو عجیب فکری و عملی پراگندگی پیدا ہو جائے گی[1]۔ دنیا کا ہر نظام قانونی اصولیات کے تحت جزئیات کو مرتب کرتا ہے۔ مثلاً اینگلو سیکسن لاء اصولوں کے مختلف سیٹ رکھنے کی وجہ سے متعدد لیگل طرزِ فکر (SCHOOLS OF THOUGHT) رکھتا ہے۔ ہمارا نظامِ قانون بھی اس کے بغیر نہیں چل سکتا۔ میں اس توسع کے خلاف نہیں جو مولانا شبیر احمد صاحب کے مزاج میں ہے، مگر کم علم ہونے کے باوجود

[1] خوش قسمتی سے قریبی عرصے میں ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی (اسلام آباد) کے رسالہ فکر و نظر (اپریل ۔ جون ۱۹۸۹ء) میں ایک مختصر اور اچھا مضمون فقہ کے قواعد کلیہ کے متعلق محمود احمد غازی کے قلم سے شائع ہوا ہے۔

فروع بلا اصول کو صحیح نہیں سمجھتا۔ عوام کو قواعدِ کلیہ کے کسی ایک سسٹم کے تحت فروع کو لے کے چلنا چاہیے۔ خواص کا حساب کتاب اُن کے سر۔

۲- ایک گزارش زبان سے متعلق ہے۔ "زیرجامہ" کا لفظ آج کل اُس مختصر اور ہلکے پہناوے کے لیے بولا جاتا ہے جو عام لباس کے نیچے صفائی ستھرائی یا حیاداری کے خاص احساس سے پہنا جاتا ہو۔ ص- ۱۵۸ میں اسے تہ بند یا تہمد یا جسم کے زیریں حصّے کے لباس کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ چنانچہ مترجم کے الفاظ ہیں "زیرجامہ، یعنی سلوار یا تہ بند" (ص ایضاً)۔

۳- ص ۱۷۱ "عورت سر سے لے کر پیروں کے تلوے تک ساری کی ساری ستر ہے"۔ "عورت کا پورا بدن ستر ہے" (ص ۱۹۳)۔ یہاں لفظ عورۃ اور ستر کے مفہوم کو واضح کرنا ضروری تھا۔

۴- "اُولِی الْاِرْبَةِ" (النور ۳۱) کے بعد اسی آیت کا حصّہ "اَوِ الطِّفْلِ الَّذِیْنَ..." ص ۲۰۸ میں پیش کیا گیا ہے۔ اس پہ جو وضاحت بیان کی گئی وہ زمانۂ قدیم سے کتابی دنیا میں چلی آرہی ہے۔ مگر اب حال یہ ہو گیا ہے کہ میں نے ۸، ۱۰ سال کے ملازم بچوں کے متعلق ایسی روایات سُنی ہیں کہ ایک کہتا ہے کہ ہماری بیگم صاحبہ کا فلاں حصّۂ جسم مکھن کی طرح ہے۔ "جماع پر قادر نہ ہونا" اور "عورتوں کے احوال سے آگاہ نہ ہونا" پہلے زمانے میں اور درجے پر تھا اور اب سنیما، ٹیلی وژن اور عریاں کہانیوں اور تصویروں نے کسی اور درجے میں پہنچا دیا ہے۔

۵- ص ۱۸۲ پر "اَلْحَمْوُ الْمَوْتُ" کا معنی کہ وہ تو ہلاکت ہے، اس کے ساتھ دوسرا یہ مفہوم بھی قابلِ توجہ کہ موت کی طرح اس سے تحفظ (پردہ) ممکن نہیں۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ خاوند کے بھائیوں اور دوسرے قریبی رشتہ داروں سے پردہ کرنا بعض خادمِ دین زوجین کے لیے نہ صرف سخت آزمائش بنا بلکہ ان کے لیے دعوت کا کام کرنا ممکن نہ رہا۔ اس کے لیے معتدل راستہ یہی ہے کہ زینتوں کے اخفا کے ساتھ عورت ان کے سامنے آئے اور ہنسی ٹھٹھول اور لوچدار گفتگو کے بغیر ضروری حد تک ان سے بات کرے۔ ہاتھوں اور چہرے کا استثنیٰ باہر کے لیے نہیں، قریبی نامحرم رشتہ داروں کے لیے تو ضرور ہو سکتا ہے۔ یہ مسائل بھی کتابی دنیا میں رہ کر نہ سوچے جائیں بلکہ تمدن و معاشرت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

۶- مالکیوں کا قول کہ خوب صورت عورت کے لیے تو چہرے اور ہاتھوں کا چھپانا واجب ہے،

جبکہ بدصورت عورت کے لیے واجب نہیں۔ اس پر کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ اسلام شریعت کا خوبصورت اور بدصورت کے لیے یا حبش اور فرنگن کے لیے الگ الگ قرار پانا عجیب سی بات ہے۔ دوسرے یہ کہ کون فیصلہ کرے گا کہ خوبصورت کون ہے، کون نہیں؟ عدالت یا مفتی یا سلطانِ وقت یا عورت خود۔ مشکل ہی سے بدصورت عورت بھی اپنے آپ کو بدصورت سمجھے گی۔ تیسرے یہ کہ اس حکم کے معنی یہ ہیں کہ اشرار یہ جان لیں کہ برقعوں والیاں خوبصورت عورتیں ہیں۔ چوتھے یہ کہ کسی لمحے میں کسی مردانہ نگاہ کو کالے رنگ یا ٹیڑھے میڑھے نقوش کی عورت میں کشش محسوس ہو سکتی ہے۔ چال سے یا آواز سے یا لسانی مہارت یا فن رقص و موسیقی کے کمالات سے۔ ایسے مستنبط احکام (کسی کے بھی ہوں) ہر مصنف یا مترجم کو تبصرہ کرنا چاہیے۔ (ص ۱۹۴)

(۷) یہ مسئلہ بھی قابلِ غور ہے کہ حضورؐ کے ارشاد کہ "لعن اللہ الواصلۃ والمستوصلۃ" کی شرح میں بالوں میں بال جوڑنا یا جوڑا لگانا حرام قرار دیا گیا ہے۔ آگے فقہی تشریحات میں یہ گنجائشیں سامنے آتی ہیں کہ انسانی بالوں کے علاوہ بکری، بھیڑ (یا گھوڑے، گدھے؟) کے بال لگائے جا سکتے ہیں اور مصنوعی جوڑا ملایا جا سکتا ہے۔ کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ خیر، اگر ایسا ہو تو اب تو نائیلون کے بال ہر سائز اور شکل اور رنگ کے اور ان کی "وگز" بھی ملتی ہیں۔ بکریوں بھیڑوں کا دور گیا۔ (ص ۶۶ تا ۷۵)

(۷) موزوں پر مسح کی رخصت کی یہ علت بیان سے رہ گئی کہ مطلوب تکلیفِ بے جا سے بچانا اور رعایت دینا ہے، نہ کہ مسح ان موزوں پر کیا جائے جو گرد و غبار وغیرہ کو روکیں۔ علاوہ ازیں جرابوں کے بارے میں مسح کا جو اشتباہ ہمارے ہاں پھیلا ہوا ہے اسے رفع کرنے کے لیے نوٹ لکھا جاتا تو اچھا تھا۔

(۸) مستحاضہ کے متعلق (ص ۱۰۷) پر حضرت ابن عباسؓ کے قول کی بنا پر بتایا گیا ہے کہ مرد ایسی عورت سے جماع کر سکتا ہے، چاہے خون اس کی ایڑیوں تک بہہ رہا ہو۔ (توبہ، توبہ، مرد بھی کیا بلا ہوتے ہیں) کیوں نہ اس عورت کو مریضہ سمجھا جائے ورنہ تو حالت بخار میں بھی جواز ہی جواز ہے۔

حضرت عائشہؓ کی یہ لطیفہ گوئی فرحت دے گئی کہ عبداللہ بن عمرؓ عورتوں کو غسلِ خاص کے وقت صرف مینڈھیاں کھولنے ہی کا حکم کیوں دیتے ہیں، سیدھی طرح کہیں کہ وہ سر منڈوا کر نہایا کریں۔ (ص ۱۱۳)

(۹) یہ جو ختنۂ نسواں کا مسئلہ اٹھایا گیا، یہ تو بس کتابی انداز سے مکھی پر مکھی ماری گئی ہے۔ اس چیز کا تو تصور بھی مدتوں سے ختم ہو چکا۔ اگر بات ضروری ہے تو محض فقہ میں ذرا سا مسئلہ بیان کرنے کے بجائے

اس کے لیے مہم کرنی چاہیئے اور ضروری نہیں ہے تو ایک "گاؤخورد" شو شے کو تجدد پسندوں کے سامنے لا رکھنا ہے ایسا ہے جیسے بھیڑیوں کے سامنے بزغالے کو۔

اگر میں لکھتا ہی چلا جاؤں تو مجھے لذتِ خامہ فرسائی باوجود علالت کے نہ جانے کہاں تک لے جائے گی۔ آخر میں مجھے عاجزی سے یہ عرض کرنا ہے کہ مصنفِ کتاب کا بھی اور مولینا سید شبیر احمد صاحب کا خصوصاً بہت احترام کرتا ہوں۔ وہ مجھ سے خصوصی شفقت برتتے ہیں۔ مگر بات یہ ہے کہ ہم جب تنقید و تبصرہ کی کرسی پر بیٹھتے ہیں تو پھر طائرِ دماغ قاضی شریح کے تصور کے پر لگا کر اونچا اُڑنے لگتا ہے۔ امید ہے کہ محترمی سید شبیر صاحب معاف فرمائیں گے۔

مجموعی طور پر یہ کتاب بڑی قابلِ قدر اور اہم ہے اور عورتوں کو اسے ضرور پڑھنا چاہیئے۔ بلکہ ذرا "غضِ بصر" کے ساتھ مردوں کو بھی۔ نوجوان البتہ پرہیز کریں۔

میٹھی کونین | از ع، ح، بخارہ علیگ۔ ناشر: ادارۂ تعمیرِ ادب۔ آر، ۷، ۴م ۱۹، النور سوسائٹی، منصورہ کراچی۔ سفید کاغذ پر ۲۵۳ صفحات، آرٹ کارڈ کا سادہ دبیز سرورق۔ قیمت: ۴۰/- روپے۔

میرا خیال ہے کہ اس میٹھی کونین کی پہلے بھی ایک خوراک ہم دے چکے ہیں۔ اب بخارہ صاحب کے تقاضے سے ایک خوراک اور! یہ بخارہ صاحب کا مجموعۂ کلام ہے۔ کونین کی چند میٹھی گولیاں:۔

ع میں ہوں جیب خرچ طبیب کا، میں مطب کی فصلِ بہار ہوں
مجھے زندگی سے غرض ہے کیا، میں رفیقِ کنجِ مزار ہوں

فدائے کنج مزار، یا شہیدِ کنجِ مزار پڑھیں تو کیسا رہے!

ع جینے والے ہیں پریشاں کہ مکانات نہیں
مرنے والوں کو یہ شکوہ کہ مزارات نہیں

؎ اک ترے مژگاں سے وابستہ ہیں لاکھوں حسرتیں
عرضیاں کتنی ہیں نتھی اک ذرا سے پن کے ساتھ

؎ کس درجہ خوش اخلاق ہے اپوا کی چھیتی
خوش رکھتی ہے ہر فرد کو شوہر کے علاوہ

؎ ایسا چڑھا بخار کہ صورت اُتر گئی
آئینہ دیکھنا بھی انہیں عار ہو گیا

؎ سرحشر بھی تم نہ چوری سے چُوکے
یہاں بھی نگاہیں چُرا لی گئی ہیں

خیال رہے کہ اس میٹھی کونین کے زیادہ استعمال سے بخار اور زور پکڑتا ہے۔ لکھنے والے صاحب تو سراپا بخار ہی ہو گئے۔ قارئین ذرا احتیاط کریں۔

معذرت

علالت کی بادِ سموم کے تھپیڑے کچھ دنوں سے ذرا پُرزور ہو گئے تھے، اس وجہ سے کام کا توازن قائم رکھنا مشکل ہو گیا۔ پھر بھی فرائض ادا کیے۔ مگر بدقسمتی سے مطبوعات کے لیے جگہ اتنی کم رہی اور فقہ النساء کا تبصرہ خلافِ معمول اتنا پھیل گیا کہ نہایت اہم کتابیں عرصے سے میرے لیے بارِ امانت ہیں اور کتنے ہی بزرگوں اور احباب کے سامنے شرمندہ ہوں۔ خدا خیر کرے تو کبھی رسالے کا مطبوعات نمبر ہی نکال دیا جائے۔ اور تو مسئلے کا کوئی حل نہیں نظر آتا۔ بہر حال اب تک کی کوتاہی سے درگزر کریں اور آئندہ کی کوتاہیوں کو معاف کرنے کے لیے تیار رہیں۔

(ن۔ص)

اکتوبر ۱۹۸۹ء

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۴۰

تحریکِ اسلامی یورپ

— از —

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

- کتاب : جس کا آپ کو عرصے سے انتظار تھا
- کتاب : جو رسائل کے دامن میں بکھر کر کھو گئی تھی
- کتاب : جو معانی کا سمندر اور دعوتِ اسلامی کا قلزم اپنے دامن میں رکھتی ہے
- کتاب : جو اسلام کی دعوت لے کر یورپ کی بستی بستی میں جانے کا جذبہ اور داعیہ پیدا کرتی ہے
- کتاب : جو آپ کے بے شمار سوالات کے تسلی بخش جواب دیتی ہے
- کتاب : جو ملحدانہ ماحول اور مادہ پرستانہ فضا میں توحید کی آواز بلند کرتی اور روحانیت کی شمع روشن کرتی ہے
- کتاب : جو دورِ حاضر میں اسلامی انقلاب کی بانگِ درا ہے
- کتاب : جس کے بغیر مولانا مودودیؒ کا لٹریچر آپ کے پاس نامکمل ہے

ضخامت : ۲۵۶ صفحات ○ سائز : ۲۰ × ۳۰ / ۱۶

قیمت : -/۱۸ روپے

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ

اُردو بازار ○ لاہور